زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ اشراق

جولائی 2024ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد ۲ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۴ء ذوالحجہ/محرم الحرام ۱۴۴۵ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

ہیومن مِلک بینک اور رضاعت ــــ غامدی صاحب کا موقف — سید منظور الحسن — 3

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 153-167 (10) — جاوید احمد غامدی — 8

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 12

مقامات

امین احسن (1) — جاوید احمد غامدی — 14

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (12) — سید منظور الحسن — 30

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

نقد و نظر

تصوف: ایک متوازی دین — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 38

مشینی کلچر کا سیلاب — محمد ذکوان ندوی — 48

فکرِ غامدی پر تنقید کیسے کریں؟ — سید منظور الحسن — 55

اصلاح و دعوت

مغرب اور آج کا چیلنج — ریحان احمد یوسفی — 58

سیر و سوانح

حیاتِ امین (11) — نعیم احمد بلوچ — 61

ادبیات

دھواں — جاوید احمد غامدی — 68

حالات و وقائع

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ (2) — محمد حسن الیاس / رانا معظم صفدر — 70

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 77

افادات غامدی
سید منظور الحسن

ہیومن مِلک بینک اور رضاعت—غامدی صاحب کا موقف

(محمد حسن الیاس صاحب کے ساتھ ایک مکالمے سے ماخوذ)

حقیقی ماں کی جگہ اگر کوئی دوسری عورت بچے کو اپنا دودھ پلائے تو وہ اُس کے لیے بمنزلۂ ماں ہے۔ شریعت نے اُسے رضاعی ماں کا درجہ دیا ہے اور اُس کے رشتہ داروں کو اِسی مادرانہ تعلق پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ اُس کا شوہر بچے کا رضاعی باپ ہوتا ہے اور بیٹے اور بیٹیاں رضاعی بہن بھائی قرار پاتے ہیں۔ یہی معاملہ باقی رشتوں کا ہے۔ اِن رشتوں پر نکاح سے متعلق وہ تمام پابندیاں عائد ہیں، جو نسب کی بنا پر مشروع ہیں۔ یعنی نکاح کے لیے جو رشتے رحم اور خون کے تعلق سے حرام ہیں، وہ چھاتی اور دودھ کے تعلق سے بھی حرام ہیں۔ یہی وہ تناظر ہے، جس میں رضاعت اور مرضعہ کے مفہوم و مصداق اور اطلاق و انطباق کے حوالے سے متنوع فقہی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اِن میں سے چند نمایاں یہ ہیں:

* رضاعت کا اطلاق ہر عمر کے بچے پر ہو گا یا دودھ پینے کی عمر والے بچے ہی اِس زمرے میں شمار ہوں گے؟

* رضاعی ماں کا درجہ پانے کے لیے کیا دودھ کی کوئی مقدار یا دودھ پلانے کا کوئی عرصہ مقرر ہے؟

* کوئی خاتون اگر کسی بچے کو اتفاقاً یا وقتی ضرورت کے تحت چند گھونٹ دودھ پلا دے تو کیا اُسے رضاعی ماں کا درجہ حاصل ہو جائے گا؟

* اگر چھاتی سے دودھ نچوڑ کر کسی اور ذریعے سے بچے کو پلا دیا جائے تو کیا اُسے بھی رضاعت سے تعبیر کیا جائے گا؟

یہ اور اِس نوعیت کے بعض دیگر سوال ہمیشہ علما و فقہا کے سامنے آئے ہیں اور اُنھوں نے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق اِن کا جواب دیا ہے۔

موجودہ زمانے میں قائم ہونے والے ہیومن مِلک بینک ـــ جس میں متعدد خواتین کا دودھ اکٹھا کر کے مختلف صورتوں میں دستیاب کیا جاتا ہے ـــ کے بارے میں بھی اِسی نوعیت کے بعض سوال پیدا ہوئے ہیں۔ اِن میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ایسے بینک کا جمع کیا ہوا دودھ پلانے پر رضاعت کے احکام کا اطلاق ہو گا اور نتیجتاً دودھ فراہم کرنے والی تمام خواتین رضاعی مائیں قرار پائیں گی؟

ہمارے فقہا کی عمومی رائے کے مطابق اِس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ وہ ایسی ہر صورت پر رضاعت کا حکم لگاتے ہیں، جس کے نتیجے میں دودھ بچے کے پیٹ میں جا کر اُس کی خوراک کا حصہ بن جائے۔ اُن کے نزدیک رضاعت کے حکم کی علت دودھ کی پیٹ میں منتقلی ہے، منتقلی کا ذریعہ نہیں ہے۔ چنانچہ ماں کا دودھ چھاتی سے پلایا جائے یا کسی برتن ـــ مثلاً گلاس، بوتل، چمچ وغیرہ ـــ سے، ہر دو صورتوں میں وہ اُسے رضاعت پر محمول کرتے ہیں۔ فقہا کے اِس موقف کی روشنی میں ہیومن مِلک بینک پر کوئی اصولی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اِس صورت میں تعددِ رضاعت واقع ہوتی ہے، جو ممنوع نہیں ہے۔ یعنی وہ تمام خواتین بچے کی رضاعی ماں قرار پاتی ہیں، جن کا دودھ اُس کے حلق سے اتر کر خوراک کا حصہ بنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے علما نے اِس پر کوئی اصولی تنقید نہیں کی۔ اُن کی تنقید اِس کے طریقۂ کار اور اُس کے ممکنہ نتائج پر ہے۔ اِس طریقۂ کار میں یہ مسئلہ ہے کہ نہ دودھ مہیا کرنے والی خاتون کی شناخت ہو سکتی ہے اور نہ اُس کے پلائے گئے دودھ کی مقدار کا تعین کیا جا سکتا ہے،[1] لہٰذا رضاعت کا معاملہ محلِ اشتباہ میں آ جاتا ہے۔ اِس اشتباہ کے نتیجے میں یہ اندیشہ قائم ہو جاتا ہے کہ انجانے میں ایسے افراد باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں، جو درحقیقت رضاعی رشتہ دار ہوں اور اُن سے نکاح ممنوع ہو۔ یہی وہ اندیشہ ہے کہ جس کی پیشگی روک تھام کے لیے ہمارے علما نے سدِ ذریعہ کے

---

[1] ۔ واضح رہے کہ رضاعت کے حکم کے اطلاق کے لیے فقہا کے نزدیک دودھ کی خاص مقدار مقرر ہے۔

اصول پر ہیومن مِلک بینک اور اُس کی مصنوعات کو ناجائز قرار دیا ہے۔

اِس ضمن میں استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کا موقف درجِ ذیل نکات پر مبنی ہے:

اولاً، اللہ تعالیٰ نے جن معاملات میں حرمت قائم کی ہے، اُن کے بارے میں حساسیت ناگزیر ہے۔ یہ حساسیت اُس حدود آشنائی کی اساس ہے، جو نفس کی پاکیزگی کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ دین کا منشا ہے کہ لوگ اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کے قریب بھی نہ جائیں اور اگر کوئی مشتبہ صورت درپیش ہو تو اُس سے گریز اور کنارہ کشی کا رویہ اختیار کریں۔ مجبوری اور اضطرار کی حالت میں البتہ، ایسی چیزوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اِس صورت میں بھی بہ قدرِ ضرورت استعمال کرنا چاہیے، ھنیئاً مریئا ہرگز نہیں بنالینا چاہیے۔ اِنھیں مرغوب اور مستعمل بنانے سے حرمت کی شناعت کا احساس بہ تدریج ختم ہو جاتا ہے اور انسان آگے بڑھتے بڑھتے اُن حدود سے بھی گزر جاتا ہے، جن کی پابندی اُس کے تزکیۂ نفس کے لیے ضروری ہے۔ ہیومن مِلک بینک سے وہ حساسیت مجروح ہوتی ہے، جو رضاعت کے باب میں شریعت کا مقصود ہے۔ طبی لحاظ سے اگر یہ ناگزیر ہے تو اِس کی مصنوعات کو حالتِ اضطرار تک محدود رکھنا چاہیے اور اُسی موقع پر استعمال کرنا چاہیے، جب کوئی متبادل صورت میسر نہ ہو۔

ثانیاً، جہاں تک اِس سوال کا تعلق ہے کہ کیا ہیومن مِلک بینک یا اِس طرح کے کسی بندوبست کو رضاعت پر محمول کیا جا سکتا ہے تو اِس کا جواب نفی میں ہے۔ رضاعت کی علت فقط دودھ کا حلق سے اترنا نہیں، بلکہ وہ پورا مادرانہ عمل ہے، جو ایک عورت ماں کے قائم مقام کے طور پر انجام دیتی ہے۔ اِس میں پہلے وہ بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری اٹھانے کا فیصلہ کرتی ہے، پھر اُسے گود لیتی ہے اور اپنی چھاتی کے ذریعے سے دودھ پلانے کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اِس عمل کے لیے رضع اور ارضاع کے افعال استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کے معنی چھاتی کو چوسنے کے ہیں۔ رَضِعَ، رَضَعَ: امْتصَّ ثَدْيَها: یعنی (بچے کا) عورت کی چھاتی کو چوسنا۔[2]

---

[2]۔ تاج العروس 21/96۔

امام محمد بن اسماعیل صنعانی نے ”بلوغ المرام“ کی شرح میں لکھا ہے:

”فمتَى الْتَقَمَ الصَّبِيُّ الثَّدْيَ وامتصَّ منهُ ثمَّ ترکَ ذلكَ باختيارِهِ منْ غيرِ عارضٍ كانَ

اِن میں 'ارضاع' کا فعل مبالغے پر دلالت کرتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہی عمل حقیقی معنوں میں رضاعت قرار پائے گا، جس میں دودھ پلانا اتمام، اکمال اور اہتمام پر مبنی ہو۔ اِس کے بغیر دودھ پینے یا پلانے کو رضاعت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''رضاعت کے رشتہ کو مادرانہ رشتے سے مشابہت حاصل ہے۔... جو بچہ جس ماں کی آغوش میں، اُس کی چھاتیوں کے دودھ سے پلتا ہے، وہ اُس کی پوری نہیں تو آدھی ماں تو ضرور بن جاتی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس کا دودھ اُس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، اُس سے اُس کے جذبات و احساسات متاثر نہ ہوں۔ اگر نہ متاثر ہوں تو یہ فطرت کا بناؤ نہیں، بلکہ بگاڑ ہے اور اسلام، جو دین فطرت ہے، اُس کے لیے ضروری تھا کہ اِس بگاڑ کو درست کرے۔... لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تعلق مجرد کسی اتفاقی واقعے سے قائم نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے یہاں جن

ذلكَ رضعةً.''(260/6)

''جب بچہ پستان کو اپنے منہ میں لے لے اور اُسے چوسے اور پھر اپنے اختیار سے کسی رکاوٹ کے بغیر چھوڑ دے تو یہ ایک دفعہ دودھ پینا کہلائے گا۔''

رضاعت کی حقیقت کے حوالے سے امام ابن حزم کا بھی یہی موقف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَأَمَّا صِفَةُ الرِّضَاعِ الْمُحَرِّمِ، فَإِنَّمَا هُوَ :مَا امْتَصَّهُ الرَّاضِعُ مِنْ ثَدْيِ الْمُرْضِعَةِ بِفِيهِ فَقَطْ.فَأَمَّا مَنْ سُقِيَ لَبَنَ امْرَأَةٍ فَشَرِبَهُ مِنْ إنَاءٍ، أَوْ حُلِبَ فِي فِيهِ فَبَلَعَهُ؛ أَوْ أُطْعِمَهُ بِخُبْزٍ، أَوْ فِي طَعَامٍ، أَوْ صُبَّ فِي فَمِهِ، أَوْ فِي أَنْفِهِ، أَوْ فِي أُذُنِهِ، أَوْ حُقِنَ بِهِ :فَكُلُّ ذَلِكَ لَا يُحَرِّمُ شَيْئًا، وَلَوْ كَانَ ذَلِكَ غِذَاءَهُ دَهْرَهُ كُلَّهُ.(المحلی10/185)

''جہاں تک رضاعت کی حرمت کا تعلق ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی نے عورت کی چھاتی سے منہ لگا کر چوسا ہو۔ جہاں تک ایسے فرد کا تعلق ہے، جسے کسی عورت کا دودھ کسی برتن سے پلایا گیا یا اُسے برتن میں ڈالا گیا اور اُس نے اُسے پی لیا یا وہ دودھ اُس کی روٹی یا کھانے میں ملا دیا گیا یا اُس کے منہ یا ناک یا کان میں ڈالا گیا یا حقنہ کے ذریعے سے جسم میں داخل کیا گیا۔ اِن صورتوں میں سے کوئی صورت بھی رضاعت کی حرمت کو قائم نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ اگر وہ زندگی بھر یہی (دودھ) بہ طورِ خوراک استعمال کرتا رہے۔''

لفظوں میں اِس کو بیان کیا ہے، اُس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ اتفاقی طور پر نہیں، بلکہ اہتمام کے ساتھ، ایک مقصد کی حیثیت سے عمل میں آیا ہو، تب اِس کا اعتبار ہے۔ اول تو فرمایا ہے: ''تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے۔'' پھر اُس کے لیے رضاعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ 'وَاَخَوَاتِکُمْ مِنَ الرَّضَاعَۃ'۔ عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'ارضاع' باب افعال سے ہے، جس میں فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اِسی طرح ''رضاعت'' کا لفظ بھی اِس بات سے ابا کرتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی روتے بچے کو بہلانے کے لیے اپنی چھاتی اُس کے منہ سے لگا دے تو یہ رضاعت کہلائے۔'' (تدبر قرآن 2/ 275)

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ دوددھ پلانے کے کسی عمل کو اُسی صورت میں رضاعت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جب کوئی خاتون کسی بچے کو حقیقی ماں کی طرح آغوش میں لے اور پورے اہتمام سے دودھ پلانے کا سلسلہ شروع کرے۔ اِس بنا پر اطلاقی لحاظ سے دیکھا جائے تو رضاعت درجِ ذیل اوضاع و افعال کی مجموعی صورت کا نام ہے:

* بچہ دودھ پینے کی عمر میں ہو،
* خاتون رضاعی ماں کے طور پر اُسے دودھ پلانے کا فیصلہ کرے،
* اِس مقصد کے لیے وہ اُسے اپنی آغوش میں لے،
* پھر اُسے اپنی چھاتیوں سے براہِ راست دودھ پلانے کا سلسلہ شروع کرے۔[3]

اِن اقدامات کے بعد ہی دودھ پلانے والی خاتون رضاعی ماں کا مقام حاصل کرتی ہے اور دودھ پلانے کا عمل رضاعت قرار پاتا ہے اور اِسی کے بارے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من الولادۃ. (الموطا، رقم 1887)

''ہر وہ رشتہ جو ولادت کے تعلق سے حرام ہے، رضاعت سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔''

---

[3]۔ اِس کے بعد خواہ وہ ایک دن پلائے یا ایک سے زیادہ دن پلائے، رضاعت کا اعتبار قائم ہو جائے گا۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(11)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ایمان والو، (یہ نعمت تمھیں عطا ہوئی ہے تو اب تمھارے مخالفین کی طرف سے جو مشکلیں بھی پیش آئیں، اُن میں) ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو (مشکلات کے مقابلے میں) ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ اور جو لوگ اللہ کی (اِس) راہ میں مارے جائیں، اُنھیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم (اُس زندگی کی حقیقت) نہیں سمجھتے۔ ہم (اِس راہ میں) یقیناً تمھیں کچھ خوف، کچھ بھوک اور کچھ جان و مال اور کچھ

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ اور (اِس میں) جو لوگ ثابت قدم ہوں گے، (اے پیغمبر)، اُنھیں (دنیا اور آخرت، دونوں میں کامیابی کی) بشارت دو۔ (وہی) جنھیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہیں کہ لاریب، ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں (ایک دن) اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی عنایتیں اور اُس کی رحمت ہو گی اور یہی ہیں جو اُس کی ہدایت سے بہرہ یاب ہونے والے ہیں۔ 157-153

(بیت الحرام ہی کی طرح صفا و مروہ کی حقیقت بھی اِن یہودیوں نے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا تحویل قبلہ کے اِس موقع پر یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ) صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اِس گھر کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں، اُن پر کوئی حرج نہیں کہ وہ اِن دونوں میں طواف بھی کر لیں، (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے) اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا تو اللہ اُس کی قدر کرنے والا ہے، اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (اِس معاملے میں) جو حقائق ہم نے نازل کیے اور جو ہدایت بھیجی تھی، اُسے جو لوگ چھپاتے ہیں، اِس کے باوجود کہ اِن لوگوں کے لیے اپنی کتاب میں ہم نے اُسے کھول کھول کر بیان کر دیا تھا، یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی جن پر لعنت کریں گے۔ اِن میں سے، البتہ جو توبہ کریں اور (اپنے اِس طرزِ عمل کی) اصلاح کر لیں اور (جو کچھ چھپاتے تھے، اُسے) صاف

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

صاف بیان کر دیں تو اُن کی توبہ میں اپنی شفقت سے قبول کر لوں گا اور حقیقت یہ ہے کہ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں، میری شفقت ابدی ہے۔160-158

اِس کے برخلاف جو اپنے انکار پر قائم رہے اور مرے تو اِسی طرح منکر تھے، یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ اور اُس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ اُن پر سے سزا ہی ہلکی کی جائے گی اور نہ اُنھیں کوئی مہلت ملے گی۔162-161

(ایمان والو، اِنھیں فیصلہ کرنے دو) اور (اِن سے قطع نظر کر کے تم یہ حقیقت اب اچھی طرح سمجھ لو کہ) تمھارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ سراسر رحمت ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور شب و روز کے بدل کر آنے میں، اور لوگوں کے لیے دریا میں نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہوئی کشتیوں میں، اور اُس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے، پھر اُس سے زمین کو اُس کے مر جانے کے بعد زندہ کیا ہے اور اُس میں ہر قسم کے جان دار پھیلائے ہیں ـــــ اور ہواؤں کے پھیرنے میں، اور آسمان و زمین کے درمیان حکم کے تابع بادلوں میں، (اِس حقیقت کو سمجھنے کے لیے) بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔164-163

اور (زمین و آسمان کی اِن نشانیوں کے باوجود) لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اوروں کو اللہ کے برابر ٹھیراتے ہیں۔ وہ اُن سے اُسی طرح محبت کرتے ہیں، جس طرح اللہ سے محبت کرتے ہیں، دراں حالیکہ ایمان والوں کو تو سب سے بڑھ کر (اپنے) اللہ سے محبت ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ظالم اُس وقت کو دیکھیں، جب یہ عذاب دیکھیں گے (تو اِن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے) کہ زور و اختیار، سب اللہ ہی کا ہے اور یہ کہ (اِس طرح کے لوگوں کو) اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔165

اُس وقت جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی، اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کر دیں گے اور

عذاب سے دوچار ہوں گے اور اُن کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے۔ اور اُن کے پیرو کہیں گے کہ اے کاش، ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانے کا موقع ملے تو ہم بھی اِن سے بے تعلقی ظاہر کریں، جس طرح اِنھوں نے ہم سے بے تعلقی ظاہر کی ہے۔ اِس طرح اللہ اُن کے اعمال کو اُن کے لیے سراسر حسرت بنا کر اُنھیں دکھائے گا اور دوزخ سے نکلنے کے لیے وہ کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔ 167-166

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جب کسی کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ وہ فرشتہ رحم میں داخل ہوتا اور کہتا ہے: پروردگار، یہ کیا ہے؟ اللہ بتاتا ہے کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی یا پھر جو کچھ اللہ رحم میں تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ پھر فرشتہ پوچھتا ہے: پروردگار، یہ بدبخت ہو گا یا خوش بخت؟ اِس پر بھی اللہ بتا دیتا ہے کہ وہ کیا ہو گا، بدبخت یا خوش بخت؟ پھر وہ پوچھتا ہے: پروردگار، اِس کا رزق کیا ہو گا؟ اللہ وہ بھی بتا دیتا ہے کہ اتنا اور اتنا۔ پھر پوچھتا ہے: پروردگار، اِس کی موت کا وقت کیا ہے؟ اللہ اِس کا جواب بھی دے دیتا ہے کہ فلاں اور فلاں۔ اِس کے بعد فرشتہ پوچھتا ہے کہ پروردگار، اِس کی فطرت کیا ہو گی؟ اِس کے جواب میں اللہ فرماتا ہے: وہی جو اِس کے ساتھ رحم میں بنا دی جائے گی۔ (مشکل الآثار، طحاوی، رقم 3278)

— 2 —

ابو طفیل بیان کرتے ہیں کہ میں ابو سریحہ حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا تو اُنھوں نے کہا: میں نے اپنے اِن دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: نطفہ چالیس راتیں رحم میں رہتا ہے، پھر فرشتہ اُس کی صورت گری شروع کرتا ہے۔ زہیر کہتے ہیں: میرا گمان ہے کہ اُنھوں نے کہا: وہی فرشتہ جو اُس کی تخلیق پر مقرر ہے، اور کہتا ہے: اے میرے رب، عورت ہو گی یا مرد ہو گا؟ پھر اللہ تعالیٰ اُس کے مرد یا عورت ہونے کا

فیصلہ کر دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: اے میرے رب، یہ ہر لحاظ سے درست ہو گا یا ناقص رہ جائے گا؟ پھر اللہ تعالیٰ اُس کے درست یا ناقص رہ جانے کا بھی فیصلہ کر دیتا ہے، پھر وہ کہتا ہے: اے میرے پروردگار، اِس کا رزق کتنا ہو گا؟ اِس کی مدت حیات کتنی ہو گی اور اِس کا اخلاق کیسا ہو گا؟ اِس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اُس کے بدبخت یا خوش بخت ہونے کے بارے میں بھی طے کر دیتے ہیں۔ (صحیح مسلم، رقم 4790)

— 3 —

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی نفس کو تخلیق کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو رحم میں موجود فرشتہ سوال کے بعد سوال پوچھتا ہے، یعنی پروردگار، یہ مرد ہے یا عورت؟ سو اللہ اُس کے جواب میں اِس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ پھر وہ پوچھتا ہے کہ اے میرے رب، یہ نیک بخت ہو گا یا بدبخت؟ اللہ اِس کا بھی فیصلہ کر دیتا ہے۔ اِس کے بعد وہ اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ہر وہ چیز لکھ دیتا ہے جو اُس کو پیش آئے گی، یہاں تک کہ وہ مصیبت بھی جو اُسے لاحق ہو گی۔ (صحیح ابن حبان، رقم 6312)

مقامات

جاوید احمد غامدی

امین احسن

(1)

اسلام کے دور جدید کا دوسرا عالم دنیا سے رخصت ہو گیا۔ 1930ء میں امام حمید الدین فراہی نے اِس عالم فانی سے رخت سفر باندھا تو صاحب ''معارف'' سید سلیمان ندوی نے اِس دور کے پہلے عالم کا ماتم کیا تھا۔ اِس کے کم و بیش 67 برس بعد آج ہم فراہی کے جانشین امین احسن اصلاحی کا ماتم کر رہے ہیں۔ سقراط و فلاطوں، ابو حنیفہ اور ابو یوسف، ابن تیمیہ اور ابن قیم ــــ یہ جس طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، فراہی و اصلاحی بھی دنیا میں اب ہمیشہ ایک ہی وجود کے دو نام رہیں گے:

چوں تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز
قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرای من

علم کا جلال و جمال، فقر کا وقار، عجز کی تمکنت، مجسم استغنا، سراپا محبت، خدا کے آخری الہام کا عہد آفریں شارح، دین و شریعت میں ایک نئی دنیا کا نقیب، صاحب طرز انشا پرداز، صاحب طرز خطیب، حسن تکلم کا وہ انداز کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

میں نے امین احسن کو سب سے پہلے 1973ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ میرے لیے اُس وقت اُن کا دروازہ 'در نکشودہ' ہی تھا، لیکن میں نے ہمت کی اور اِسی بند دروازے پر بیٹھ گیا:

بر در نکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد

پھر وہ دروازہ کھلا اور اِس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا۔ اُس دن سے آج تک علم و عمل کی جو دولت بھی ملی ہے، خدا کی عنایت سے اور اِسی دروازے سے ملی ہے:

ملکت عاشقی و گنج طرب
ہر چہ دارم زیمن ہمت اوست

1987ء میں جب میں نے ''دبستان شبلی'' کی داستان لکھی تو امام فراہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: امین احسن اصلاحی اِسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں۔ وہ اپنے استاد سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ حمید الدین جس مقام پر پہنچے تھے، اُن کی ساری عمر اِسی کے اسرار و رموز کی وضاحت میں گزری ہے۔ اُن کی ''تدبر قرآن'' تفسیر کی کتابوں میں ایک بے مثال شہ پارۂ علم و تحقیق ہے۔ اُن کے قلم سے پچاس برس کے معرکوں کی روداد سنیے تو بقول عرفی:

رمح او گوید اگر جنگ و گر صلح کہ من
بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقاں رفتم

میں نے لکھا تھا: ''دبستان شبلی'' کی آخری نشانی اب امین احسن ہی ہیں۔ اُن کے تلامذہ و احباب میں کتنے ہیں جو اِس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے اِسی احساس کی آگ ہے جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اِس کی چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں دب جاتی ہیں، مگر بجھنے نہیں پاتیں:

کہ آتشے کہ نہ میرد ہمیشہ در دل ماست

اب یہ آخری نشانی بھی دنیا میں نہیں رہی۔ 15/ دسمبر 1997ء کو صبح 3 بجے، ٹھیک اُسی وقت جب وہ اپنے پروردگار کے حضور میں حاضری کے لیے اٹھا کرتے تھے، ہمیشہ کے لیے اُس کے

حضور میں حاضر ہو گئے۔ اُن کی ساری زندگی قرآن کے اسلوب و مدعا کی مشکلیں حل کرتے ہوئے گزری۔ اب کیا ہے، جہاں مشکل پیش آئے گی، خود صاحب قرآن سے پوچھ لیں گے۔ اُن کی دنیا تو اب وہ ہے کہ جہاں:

بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہی تواں خرید

امین احسن کیا تھے؟ اب سے کئی برس پہلے جب اِس شہر کے کچھ مذہب فروشوں نے اُن کا مقام معتقدین کی تعداد سے متعین کرنا چاہا تو میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا: مجھے اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا کہ میرا سرمایۂ فخر اگر کچھ ہے تو بس یہی ہے کہ مجھے امین احسن سے شرف تلمذ حاصل ہے، لیکن جہاں تک امین احسن کا تعلق ہے تو میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تگ و دو کا ہدف وہ چیزیں کبھی رہی ہی نہیں جن پر یہ لوگ جیتے اور مرتے ہیں۔ اِن زخارف کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی اُس نے ہمیشہ اپنی شان سے فروتر سمجھا ہے۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے وہ طریقے جو اِن حضرات کے لیے 'هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا' ہیں، اُن کا ذکر بھی کوئی شخص اگر اُس کی مجلس میں کبھی کر دے تو اُس کے لیے وہاں باریابی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اُس نے عمر بھر جس چیز کو اپنا شعار قرار دیا، وہ یہ تھی کہ آدمی کا سایہ بھی اگر اُس کا ساتھ نہ دے تو اُسے ہر حال میں حق پر قائم رہنا چاہیے۔ اُس نے معاشرے میں پھیلی ہوئی فکر و عمل کی سب غلاظتوں کو جمع کر کے اُنھیں دلائل فراہم نہیں کیے، دل و دماغ کو اِن غلاظتوں سے پاک کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ ہر پستی میں نہیں اترتا، اُنھیں اُن بلندیوں کی طرف بلاتا ہے جن پر وہ اپنے شعور کے پہلے دن ہی سے فائز رہا ہے۔ اُس کی دنیا علم و دیانت کی دنیا ہے، مذہبی بہروپیوں اور سیاسی بازی گروں کے لیے اِس دنیا میں کوئی جگہ پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے ذرۂ ہستی میں ایک صحرا اور اپنے وجود میں ایک سمندر رہے۔ اُس کی اپنی اقلیم ہی میں اُس کے لیے اتنے مشاغل ہیں کہ اِس طرح کی چیزوں کے لیے اُس کے پاس کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اُس نے جس میدان میں عمر بھر محنت کی ہے، وہ پیری مریدی کا نہیں، علم و تحقیق کا میدان ہے۔ اُس کی محنت کا حاصل اگر کسی شخص کو دیکھنا ہو تو وہ اُس شہ پارۂ علم و تحقیق کو دیکھے جسے اب دنیا ''تدبر قرآن'' کے نام سے جانتی ہے۔ وہ بندۂ امروز نہیں، مرد فردا ہے اور اُس کا زمانہ اب بہت زیادہ دور نہیں رہا۔

''تدبر قرآن'' کی تسوید کا کام اِس مرد فردا نے 1957ء میں کسی وقت شروع کیا۔ اِس کی

تیاری وہ اُس زمانے سے کر رہے تھے جب 1925ء میں امام فراہی نے اپنے گھر کے کسی گوشے میں کھڑے ہوئے اُن سے کہا تھا: امین احسن، اخبار نویسی کرتے پھرو گے یا ہم سے قرآن پڑھو گے؟ وہ بتاتے تھے کہ میں اُس زمانے میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اچھے مشاہرے پر کام کر رہا تھا، لیکن میں نے بغیر کسی توقف کے عرض کیا: میں آپ سے قرآن پڑھوں گا۔ امام فراہی نے اپنی اقامت گاہ ہی کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: آپ یہاں ٹھیریں گے، اور میں ادارت سے استعفا دے کر ایک مرتبہ پھر طالب علمانہ زندگی گزارنے کے لیے اُس کمرے میں آ کر ٹھیر گیا۔ بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کسی کالج میں پروفیسری کے لیے اُن کا نام تجویز کیا اور کالج کے ذمہ داروں سے ہامی بھر لی کہ وہ اُنھیں راضی کر لیں گے۔ امین احسن کو بتایا گیا تو وہ چلچلاتی دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے دارالمصنفین پہنچے اور سید صاحب سے عرض کیا: آپ نے اِس فقیر کا نام تجویز کیا، آپ کا شکریہ، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ پیش کش قبول نہ کر سکوں گا۔ امام فراہی کو میں اُن کی زندگی میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ بتاتے تھے کہ سید صاحب بالکل حیران رہ گئے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک غریب طالب علم اتنی بڑی پیش کش اِس طرح ٹھکرا دے گا۔ بعد میں اُنھوں نے ندوہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ اِس واقعے کا ذکر کیا اور طلبہ سے کہا کہ دیکھو، طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال میں یہ بات کہہ کر چلا آیا، لیکن مجھے اندیشہ رہا کہ استاذ امام اِن دنوں اگر ''دارالمصنفین'' آئے تو ہو سکتا ہے کہ سید صاحب اُن سے بات کریں اور وہ مجھے بھیج دینے کا وعدہ کر لیں۔ اُن کا چہرہ ایک عجیب احساس فخر سے تمتما اٹھتا تھا، جب وہ یہ بتاتے تھے کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ استاذ امام وہاں گئے بھی اور سید صاحب نے اُن سے بات بھی کی، لیکن اُنھوں نے صاف کہہ دیا: آپ امین احسن کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں یہ ساری محنت آخر کس کے لیے کر رہا ہوں؟ فراہی کی یہ محنت رنگ لائی۔ 1930ء میں جب اُن کی وفات کا وقت قریب ہوا تو اُنھوں نے امین احسن کو بلا بھیجا۔ وہ اُس وقت متھرا کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ امین احسن کمرے میں داخل ہوئے تو فراہی نے اُنھیں دیکھ کر کہا: امین آ گئے۔ امین احسن کہتے تھے: اُنھوں نے میرا نام اپنی زبان سے اِس طرح ادا کیا کہ گویا نام نہیں لے رہے، اِس کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے علم و فکر کی امانت میرے سپرد کر رہے ہیں۔ امین احسن نے اپنی پوری زندگی اِسی امانت کا حق ادا کرنے میں صرف کر دی۔ وہ ہمیشہ

کہتے تھے: ڈرتا ہوں، خدا کے حضور میں فراہی سے ملوں تو وہ میرے کام سے مطمئن نہ ہوں۔

''تدبر قرآن'' کیا ہے؟ وہ اِس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''میں بلا کسی شائبہ فخر کے، محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اِس کتاب کی تیاریوں میں بسر کیا ہے، اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اِسی کی تحریر و تسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اِس طویل مدت میں، میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں، لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں بھی میرا ذہنی و قلبی تعلق اِس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اِس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے، اِسی کو محور بنا کر پڑھا ہے۔ جو کچھ سوچا ہے، اِسی کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ اِسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں، ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اُس پتھر کو الٹنے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے سے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اِس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی، بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے:

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ، اِس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی 35، 30 سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اِس کتاب میں جو کچھ بھی ہے، سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے، اِس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعویٰ کرنے میں صرف اِس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی اُن کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولانا سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ اُن کی رائے میرے علم میں آ گئی ہو، بلکہ میں نے اُن سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود اُن کی رہنمائی میں پورے پانچ سال اِن اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر اِنھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج

تک کام کرتا رہا ہوں۔ اِس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذ ہی کا فیض ہے، لیکن اِس میں چونکہ بلاواسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، اِس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اِس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے، اُس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے، اُس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے۔'' (41/1)

اُنھوں نے لکھا ہے:

''میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اِس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی جس میں مجھے کوئی تردد ہو۔ جہاں ذرا بھی تردد ہوا ہے، میں نے بے تکلف اُس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اُس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال کروں۔ قرآن سے باہر کی کسی چیز سے بھی کبھی میری کوئی خاص قلبی و ذہنی وابستگی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو قرآن ہی کے لیے اور قرآن ہی کے تحت ہوئی ہے۔ اِس کتاب کے پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ جہاں کہیں مجھے اپنے استاذ سے بھی اختلاف ہوا ہے، میں نے بے جھجک اُس کا بھی اظہار کر دیا ہے۔'' (42/1)

یہ تفسیر لاہور میں بھی لکھی گئی اور برسوں لاہور سے باہر خانقاہ ڈوگراں کے پاس ایک دور افتادہ گاؤں رحمٰن آباد میں سرسے اور شیشم کے درختوں کے نیچے بھی زیر تسوید رہی، جہاں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا اور نہ تصنیف و تالیف کے لیے کوئی دوسری سہولت۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ مسودہ پسینے سے بھیگ رہا ہے، لیکن مصنف کا قلم اُسی طرح رواں دواں ہے۔ وہ اِس بات سے آگاہ تھے کہ ــــ بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید ــــ قرآن کی مشکلوں کو حل کرنے اور اُس سے متعلق اپنے نتائج فکر کو سپرد قلم کرنے میں وہ دنیا کی ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست و ہم خود منزل ست

امین احسن نے یہ تفسیر قرآن پر ایمان کی جس کیفیت میں لکھی ہے، اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یاد ہے، وہ سورۂ رحمٰن کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ 'یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ'

کے تحت جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ عام خیال کے مطابق موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، لیکن قرآن بالکل صریح ہے کہ یہ دونوں ہی پانیوں سے نکلتے ہیں تو اُنھوں نے مجھے تحقیق کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا، اُن کے چہرے پر تردد کی کوئی پرچھائیں نہ تھی، بلکہ ایک عجیب اطمینان تھا اور ایمان کی ایک عجیب روشنی تھی۔ اِس موقع پر اُنھوں نے جو کچھ کہا، میں اُسے بعینہٖ تو شاید دہرا نہ سکوں، لیکن مدعا یہی تھا کہ خدا کی قسم، اگر موتی خود آکر بھی مجھے کہیں کہ وہ صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں تو میں اُن سے کہہ دوں گا، تمھیں اپنی تخلیق میں شبہ ہوا ہے، قرآن کا بیان کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

اُن کی پیدایش 1904ء میں یوپی کے ایک گاؤں بمہور میں ہوئی۔ اُن کے رشتے کے ایک چچا شبلی متکلم ندوی اُس زمانے میں ''مدرسۃ الاصلاح'' کے مہتمم تھے۔ اُنھی کے ایما سے امین احسن کے والد نے جنوری/ 1915ء میں اُنھیں اِس مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ اُن کی ساری تعلیم سرائے میر اعظم گڑھ کی اِسی درس گاہ میں ہوئی۔ یہ ایک دینی مدرسہ تھا، لیکن انگریزی زبان میں اُن کی استعداد اتنی اچھی تھی کہ علوم عالیہ کی کتابیں اِس زبان میں نہ صرف یہ کہ بغیر کسی دقت کے پڑھتے، بلکہ اُن کے ادق مطالب دوسروں کو سمجھا دے سکتے تھے۔ دینی مدارس کے طلبہ بالعموم عربی بولنے پر قدرت نہیں رکھتے، لیکن وہ جب امام فراہی سے استفادے کے لیے اُن کے پاس مقیم تھے تو بے تکلف عربی بولتے تھے۔ مشہور عالم موسیٰ جار اللہ ہندوستان آئے تو امام فراہی سے ملنے مدرسۃ الاصلاح بھی گئے۔ امین احسن ہی اُن کے میزبان تھے۔ عربی زبان میں گفتگو اور تقریر پر اُن کی قدرت دیکھ کر ایک دن اُنھوں نے پوچھا: عرب میں کتنے سال گزار کر آئے ہو؟ امین احسن نے جواب دیا: 'ما مست قدمی هاتین قط بلاد العرب' (میرے اِن دونوں پاؤں کو کبھی سرزمین عرب نے نہیں چھوا)۔ موسیٰ جار اللہ بڑی دیر تک اپنی حیرت کا اظہار کرتے رہے۔ اِسی زمانے میں ایک مرتبہ محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں کی موجودگی میں نوجوان امین احسن نے تقریر کی۔ اُن کی خطابت کا جو رنگ بعد میں نمایاں ہوا اور جس کی داد اپنے وقت کے بے مثل خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اِس طرح دی کہ خطیب تو میں بھی ہوں، لیکن تم عالم بھی ہو اور خطیب بھی، اُس کی کچھ جھلک اِس تقریر میں بھی تھی۔ لوگوں نے بہت داد دی، لیکن وہ منتظر تھے کہ استاذ امام کیا کہتے ہیں۔ شام کو درس کے لیے حاضر ہوئے تو کسی نے امام فراہی سے ذکر کیا۔ وہ

کچھ دیر دوسروں کی باتیں سنتے رہے، پھر اپنے خاص انداز میں فرمایا: ہاں بھئی، یہ بڑے ابوالکلام آزاد ہیں۔ امین احسن بتاتے تھے کہ اُنھوں نے لفظ 'آزاد' اِس طرح ادا کیا کہ اُن کی یہ تعریف میرے لیے تعریف کم اور تنبیہ زیادہ ہوگئی۔ میرے استاد کی تربیت کا یہی انداز تھا۔

اِس سے پہلے امام فراہی نے مدرسہ کے زمانے میں بھی اُن کی ایک تقریر کی تحسین اِن الفاظ میں کی تھی: ''اِس طالب علم نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔'' اِس پر اُن کے استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی نے عرض کیا: آپ کی اِس تحسین کی کوئی یادگار بھی اِس کے پاس ہونی چاہیے۔ فراہی نے اپنا ''مجموعۂ تفاسیر'' اُنھیں دیا اور اُس پر لکھا: ''بہ صلۂ حسن تقریر'' اور اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

1925ء میں اُن کے حکم پر وہ مدرسہ کے کسی کام سے ملایا گئے تو اپنے رفیق درس اختر احسن کو خط لکھا۔ اُس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ: ''سمندر کی سرجوشی کے ایام بہار ہیں۔'' امام فراہی نے پڑھا تو کہا: امین میاں تو ادیب ہیں۔ وہ خود بتاتے تھے کہ زمانۂ طالب علمی میں اگر کوئی شخص اُن سے پوچھتا کہ وہ کیا بننا چاہتے ہیں تو وہ کہتے: ادیب الہند۔

اِس دور میں شاعری کا شوق بھی رہا۔ طبیعت میں شروع سے شوخی تھی۔ مدرسہ میں اپنے ایک استاد کی ہجو لکھ دی۔ مولانا نگرامی نے بلایا، تنبیہ کی، کچھ جرمانہ بھی کیا، لیکن ساتھ ہی فرمایا: اِس میں شبہ نہیں کہ تمھاری نظم بہت اچھی ہے۔ تاہم یہ شوق اُسی زمانے میں ختم ہو گیا۔ بتاتے تھے کہ میں نے شبلی سے موازنہ کیا تو مجھے خیال ہوا کہ میں اُن جیسے شعر نہیں کہہ سکتا۔ اِس کے بعد پھر میں نے اِس کوچے میں قدم نہیں رکھا۔

مدرسہ کے زمانے میں ''سبع معلقات'' کا امتحان ہوا۔ سید سلیمان ندوی ممتحن تھے۔ امین احسن کے پرچے پر اُنھوں نے لکھا: یہ ایک طالب علم کا پرچہ ہے۔ مجھے ندوہ کے لیے اِس طرح کے استاد بھی کہاں سے ملیں گے۔

مدرسہ میں جن لوگوں کی اُن سے چشمک رہتی تھی، اُنھوں نے فراہی سے کہا: امین احسن کو نحو سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہے۔ بتاتے تھے: میں درس میں حاضر ہوا تو آتے ہی استاذ امام نے پوچھا: امین 'لِ' کیا صیغہ ہے؟ میں نے جواب دیا، معنی عرض کیے تو بڑے خشمگیں انداز میں لوگوں کی طرف دیکھا، پھر فرمایا: کون کہتا ہے کہ امین کو نحو نہیں آتی۔

اِسی طرح کے ایک موقع پر امام فراہی نے اپنے درس کے حاضرین سے پوچھا: اِس درس میں

سب سے کم سن کون ہے؟ لوگوں نے کہا: امین احسن۔ اُنھوں نے پوچھا: سب سے بعد میں کون شریک ہوا؟ لوگوں نے کہا: امین احسن۔ اِس پر فرمایا: سیدنا مسیح کا ارشاد ہے کہ کتنے ہیں جو پیچھے آنے والے ہیں، مگر دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔

اپنے اوپر استاد کے اعتماد کا ذکر وہ اِسی اسلوب میں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بتایا کہ لوگوں نے امام فراہی سے کہا: امین تو کہتے ہیں کہ عربی شاعری بھی کوئی شاعری ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اونٹنی کی تعریف کر رہے ہیں یا محبوبہ کی۔ امام فراہی نے کہا: اُنھیں کسی نے شعر سمجھایا نہیں ہو گا۔ میں آیا تو اُنھوں نے پوچھا: میں نے وہی بات دہرا دی۔ استاذ امام نے کہا: کوئی شعر پڑھو۔ میں نے معلقۂ امرؤالقیس کا پہلا شعر پڑھ دیا: 'قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل'۔ امام نے کہا: ترجمہ کرو۔ میں نے اُسی طرح ترجمہ کر دیا، جس طرح بالعموم مدرسوں میں کیا جاتا ہے۔ امام نے کہا: نہیں، یوں نہیں۔ اِس طرح ترجمہ کرو کہ: ٹھیرو، ٹھیرو، دوستو، جاناں اور منزل جاناں پہ دو آنسو بہانے دو۔ میں پکار اٹھا: لاریب، شعر ہو گیا، اب یہ شعر ہو گیا ہے۔ وہ کہتے تھے، اِس کے بعد عربی شاعری ہی میری سب سے زیادہ پسندیدہ شاعری ہو گئی۔

فراہی کا ذکر جب اُن کی زبان پر آتا تو آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ اِس کلیم ذروۂ سیناے علم کی باتیں وہ گھنٹوں کرتے، مگر سیر نہ ہوتے تھے۔ بعض واقعات ایسے دل نواز اسلوب میں سناتے کہ معلوم ہوتا، کسی دیوتا کا ذکر کر رہے ہیں۔ بتاتے تھے: ''سبع معلقات'' پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ 'لا' سمجھ میں نہیں آیا۔ سب شارحین کو دیکھا، ادیب الہند مولوی فیض الحسن سہارن پوری کی شرح بھی دیکھی، لیکن کسی راے پر اطمینان نہیں ہوا۔ کتاب لے کر امام فراہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنے دارالمطالعہ کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے مشکل بیان کی، لمحے بھر کو رکے، جیب سے پنسل نکالی اور میری کتاب پر لکھا: 'لا هي نادرة'۔ میاں، جس طرح تم لوگ نہیں کہتے کہ جس گھڑی میری موت نہ آ جائے، یہ اِسی طرح کا 'لا' ہے۔ زبان کے غوامض تک پہنچنے کا یہ انداز صرف استاد ہی کا حصہ تھا۔

فراہی کے آخری زمانے میں ہندوستان کے ایک بڑے عالم نے اُن کی کسی تحریر پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اِس سے پورے علاقے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ اور اساتذہ، سب پریشان تھے۔ میرے لیے بھی یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ اِسی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں

فراہی کو ڈھونڈتا ہوا اُن کے دارالمطالعہ کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھا، استاذ امام سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ دوڑ کر وہیں اُنھیں بتایا۔ میں خود جس پریشانی میں تھا، اُن سے بھی اِسی کے لحاظ سے کسی ردعمل کی توقع کر رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے زینے پر رکے، پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے: اچھا، یہ جن کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ تو مجھے نہیں جانتے۔ میں ہکا بکا اُنھیں دیکھتا کھڑا رہ گیا۔ اِس فتوے پر اِس سے زیادہ بلیغ کوئی تبصرہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں کہتے: فراہی یہ تھے، اِس شان کا کوئی شخص اب تم کہاں سے پیدا کرو گے؟

فراہی سے اُنھوں نے قرآن پڑھا، اُس کی زبان کا وہ ذوق پایا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ نظم قرآن فراہی کی دریافت ہے، لیکن امین احسن نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اُسے وہاں پہنچا دیا ہے کہ اُس کے منکر بھی اب انکار کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے۔ امین احسن کا پایۂ علم وہی تھا جو اِس امت میں مختلف علوم و فنون کے ائمۂ مجتہدین کا رہا ہے۔ زبان، ادب، فلسفہ و حکمت اور قرآن کے معارف، اِن سب میں وہ جس مقام پر فائز تھے، اُس سے آگے کوئی مقام آسانی سے تصور میں نہیں آتا۔ اِن علوم میں لاریب، وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ اُن کی بعض نئی تحقیقات سے متعلق جب کوئی شخص اُن سے متقدمین کے کسی حوالے کا تقاضا کرتا تو وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے: مطمئن رہیے، کچھ عرصے کے بعد ہم بھی متقدمین ہی ہو جائیں گے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں نے اُن کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بارہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بدر خشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

اُن کا مقام یہی تھا، لیکن اِس کے باوجود اپنی کسی عزیز سے عزیز رائے اور تحقیق کے خلاف بھی کوئی حق اگر سامنے آ گیا ہے تو اُن کے دل و دماغ کو میں نے اِس طرح اُس کے سامنے جھکتے دیکھا ہے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ اُن کے مدرسۂ علمی کا میں پچھلی صفوں میں بیٹھنے والا ایک طالب علم ہوں۔ سورۂ توبہ میں 'اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ' کا مفہوم اُنھوں نے جس طرح متعین کیا ہے، اُس پر مجھے اطمینان نہیں ہو سکا۔ میرا خیال تھا کہ بات بہت سادہ ہے، لیکن اُنھوں نے اِسے جس طرح دیکھا ہے، اِس کے نتیجے میں یہ بہت کچھ الجھ گئی ہے۔ اُنھی کے فیض تربیت سے جو کچھ پایا ہے، اُس کی روشنی میں ایک مرتبہ بہت ڈرتے ڈرتے میں نے اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ میری

بات سنتے رہے، سوالات بھی کیے، اِس کے بعد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: میں نے اِس آیت پر برسوں غور کیا اور اِس کے بعد ایک رائے قائم کی تھی، لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر بڑے تاثر کے عالم میں یہ شعر پڑھا:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

امام فراہی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اُنھیں خیال ہوا کہ جس طرح قرآن اُنھوں نے حمید الدین فراہی جیسے جلیل القدر عالم اور محقق سے پڑھا ہے، اِسی طرح حدیث بھی اِس فن کے کسی جید عالم سے پڑھنی چاہیے۔ ترمذی کے شہرۂ آفاق شارح عبد الرحمٰن محدث مبارک پوری کا گاؤں اُن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ امین احسن کے والد اُنھیں مولانا کے پاس لے گئے، اُنھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو محدث مبارک پوری نے فرمایا: آپ تو سب کچھ پڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کہیے تو میں اپنی سند آپ کو دے دوں۔ امین احسن نے جواب دیا: مولانا یہ شاہوں کا تاج ہے، اِسے یہ فقیر اِس طرح اپنے سر پر نہیں رکھنا چاہتا۔ میں سند لینے نہیں آیا، آپ سے حدیث سمجھنے آیا ہوں۔ مولانا نے پوچھا: کیا پڑھو گے؟ عرض کیا: آپ ترمذی کے شارح ہیں، وہی پڑھا دیجیے۔ چنانچہ درس شروع ہو گیا۔ پھر سردی ہو یا گرمی، میلوں پیدل چل کر امین احسن پوری باقاعدگی کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے:

شوق تو راہ می برد، درد تو زادمی دہد

اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ وہ بڑے لطف میں سنایا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ ترمذی کی عبارت پڑھتے ہوئے میں نے ایک جگہ بہت اعتماد کے ساتھ 'عرف' کو 'ر' کی زیر کے ساتھ پڑھا۔ مولانا نے ٹوکا: 'أنا لا أعرف عرِف' (میں اِسے 'ر' کی زیر کے ساتھ نہیں جانتا)۔ میں نے اِسی اعتماد کے ساتھ جواب دیا: 'أما أنا فلا أعرف عرَف' (اور میں اِسے 'ر' کی زبر کے ساتھ نہیں جانتا)۔ مولانا نے فرمایا: 'راجع اللغة' (لغت دیکھیے)۔ لغت کی کتاب، غالباً جوہری کی ''صحاح'' کھولی تو استاد ہی کی بات لکھی ہوئی تھی۔ میں کچھ خفیف ہوا تو مسکرائے، پھر فرمایا: 'استأنف، وللجواد زلة' (آگے چلو، اصیل گھوڑا بھی پھسل جاتا ہے)۔

امام فراہی کی وفات کے بعد اُن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اُنھوں نے ''دائرۂ حمیدیہ''

کی بنیاد رکھی۔ اُس کے تحت ''الاصلاح'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اِس دوران میں امام کی کتابوں کے ترجمے کیے اور اِس قدر عمدہ ترجمے کیے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے صاحب طرز انشاپرداز نے اُن کے بارے میں لکھا کہ کسی شخص کو اگر عربی زبان کی اعلیٰ علمی عبارتوں کے اردو میں منتقل کرنے کا سلیقہ سیکھنا ہو تو اُسے یہ ترجمے دیکھنے چاہییں۔

1941ء میں مولانا مودودی حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تو مدرسۃ الاصلاح، دائرۂ حمیدیہ، استاد کے مسودات اور علمی کاموں کے لیے اُس زمانے میں اپنے نام پر جمع پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم چھوڑ کر وہ اُن کے ساتھ ''دارالاسلام'' منتقل ہو گئے۔ مولانا مودودی سے اُنھیں اتفاق بھی رہا اور اختلاف بھی۔ اتفاق کے زمانے میں جب بعض علما نے اُن کے علم کا استخفاف کرنا چاہا تو امین احسن کی شہادت ایک برہان قاطع بن کر سامنے آئی۔ بعد میں ازراہ تفنن فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، وہ میں نے مولویوں کے مقابلے میں اُن کے علم کی شہادت دی تھی، اپنے مقابلے میں نہیں۔ کم و بیش 16 سال وہ مولانا کے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی رہے۔ اُن کے ساتھ ''جماعت'' کی علمی و فکری رہنمائی کا کام بھی کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی بڑی استقامت کے ساتھ برداشت کیں۔ بتاتے تھے کہ قرآن میں تجزیۂ مطالب اور پیروں کی تقسیم کا کام میں نے ملتان جیل میں مکمل کیا تھا۔ 1953ء میں مولانا کو موت کی سزا ہوئی تو اُن کے جذبات بے پناہ تھے۔ اختلاف کے زمانے میں بھی، جب وہ اُنھیں اپنے مخصوص اسلوب میں ''امیر المومنین'' کہتے اور اُن پر تند و تیز لب و لہجے میں تنقید کر رہے ہوتے تھے، میں نے بارہا اُن کے الفاظ کی تلاطم خیزیوں کے نیچے محبت کا ایک گہرا سمندر موجزن دیکھا ہے۔ اُنھیں افسوس تھا کہ اپنے جس دوست کے بارے میں وہ اتنی اونچی رائے رکھتے تھے، وہ کس دلدل میں اتر گیا ہے۔ 1975ء میں، میں مولانا مودودی کے گھر کے بالکل سامنے مقیم تھا۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے صحن میں نکلے تو مجھ سے پوچھا: مولانا مودودی کا گھر یہی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار دہرا رہے تھے:

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

18/ جنوری 1958ء کو یہ آشنائی امین احسن کے اِن الفاظ پر ختم ہوئی:

''میں جانتا ہوں کہ آپ کی رفاقت سے محروم ہو کر میں کیا کچھ کھو رہا ہوں، لیکن آپ کو یہ

بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آپ نے مجھ جیسے خیر خواہ مخلص کے مشوروں کی قدر نہیں کی تو آپ کو ''برے مشیروں'' کے مشورے ماننے پڑیں گے۔ میں دل سے متمنی تھا کہ مجھے آپ کی رفاقت حاصل رہے، لیکن آپ نے اپنے دونوں خطوں میں اُس کی جو قیمت مانگی ہے، میں وہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔''

مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو بڑے تاسف کے ساتھ فرمایا: آج وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس سے اتفاق میں بھی لذت تھی اور اختلاف میں بھی۔ جس دن یہ سانحہ پیش آیا وہ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، مولانا کی بذلہ سنجی کا ذکر ہوا تو پٹھان کوٹ کے زمانۂ قیام کے بعض دل چسپ واقعات سنائے۔ اُنھی میں ایک یہ لطیفہ بھی تھا۔ کہنے لگے: میری شادی ہوئی، چودھری عبد الرحمٰن صاحب، میرے خسر مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں کسی وجہ سے اُس روز عصر کی نماز میں حاضر نہیں ہو سکا۔ مولانا سے کسی نے پوچھا: امین احسن نظر نہیں آئے؟ اُنھوں نے برجستہ جواب دیا: بھائی، آج صبح سے وہ 'إن الإنسان لفی خسر' میں مبتلا ہیں۔

بذلہ سنجی اور شوخی کلام میں امین احسن کا معاملہ بھی یہی تھا۔

قید کے زمانے میں مولانا مودودی کی بتیسی غالباً ٹوٹ گئی۔ امین احسن نہیں جانتے تھے کہ مولانا کے دانت مصنوعی ہیں۔ کسی نے بتایا تو دانتوں کی ''تعزیت'' کے لیے مولانا کے پاس گئے۔ بظاہر بہت افسردگی کی کیفیت میں تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے، پھر کہا: مولانا، افسوس ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ ایک صاحب نے، جن سے دین کی خدمت کے معاملے میں وہ ایک زمانے میں اچھی توقعات رکھتے تھے، بڑے اہتمام کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں۔ اُن میں وہ تمام مکاتب فکر کے علما کو بلاتے اور اُن سے تقریریں کراتے تھے۔ دین کی خدمت کا جو تصور امین احسن رکھتے تھے، اُس میں ظاہر ہے اِس طرح کی چیزوں کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہ صاحب اُنھیں بھی دعوت دینے آئے۔ امین احسن نے پوچھا: اِن کانفرنسوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ سب نقطہ ہاے نظر کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوں۔ اُنھوں نے جواب دیا تو امین احسن نے بے ساختہ کہا: بھانت بھانت کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی یہ خدمت تو ریلوے پچھلے سو سال سے انجام دے رہی ہے۔ میرا خیال ہے، اِس کے لیے آپ کی کوئی ضرورت

نہ تھی۔

اِس معاملے میں بھی وہ صاحب طرز تھے۔ ایک بڑے عالم اور مصنف سے ناراض ہوئے تو اُن پر 'پڑھے کم، لکھے زیادہ' کا فقرہ چست کیا۔ مستشرقین کے اسلوب تحقیق پر تنقید کی تو اِس کے لیے مکھی کو گھس گھس کر بھینس بنانے اور ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھانے کے محاورے ایجاد کیے۔ فاطمہ جناح کی حمایت میں متحدہ محاذ بنا تو اُسے مینڈکوں کی پنسیری باندھنے سے تعبیر کیا۔ اِسی زمانے میں مولانا مودودی کا ایک جملہ بہت مشہور ہوا کہ ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی خرابی نہیں۔ امین احسن نے اِس پر تبصرہ کیا: تعجب ہے، اِن لوگوں میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں نکلا جو ایک ایسے مرد کا مقابلہ کر سکے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے۔ ماچھی گوٹھ کے بعد کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں مولانا مودودی امیر جماعت کے لیے غیر معمولی اختیارات کا مطالبہ لے کر اٹھے۔ امین احسن کو اِس سے شدید اختلاف تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہ راے رکھتے تھے کہ ''جماعت'' کے امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے جماعت سے استعفا دے دیا۔ اِس پر مولانا مودودی نے اُن کے نام ایک خط میں لکھا:

''میری اِس راے کو آپ چاہیں تو غلط کہہ سکتے ہیں۔ اِس کے خلاف دلائل دینے کی آپ کو پوری آزادی ہے، حتیٰ کہ آپ کو یہ بھی اختیار ہے کہ اِس کو جو بدتر سے بدتر معنی چاہیں پہنائیں، مگر آپ یہ الزام مجھ پر نہیں لگا سکتے کہ ایک بدنیتی کی بلی مدتوں سے مجرم ضمیر کے تھیلے میں چھپائے پھر تا رہا تھا اور پہلی مرتبہ اِسے موقع تاک کر کوٹ شیر سنگھ میں باہر نکال لایا۔ میں اِس راے کو حق سمجھتا ہوں۔ ہمیشہ اِس کو ظاہر کیا ہے اور تشکیل ''جماعت'' کے بعد سے آج تک اِس پر عملاً کام کرتا رہا ہوں۔ آپ کو پورا حق ہے کہ اِسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اِس کی وجہ سے جماعت کو چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ جماعت میں رہتے ہوئے آپ مجلس شوریٰ کے ذہن کو اِس سے مختلف جس راے کے حق میں بھی ہموار کرنا چاہیں، پوری آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔''

امین احسن نے اِس کا جواب دیا، اور دیکھیے کہ کیا جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے اپنی ''بلی'' کی تاریخ پیدایش ناحق بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ میں اِس بات

سے ناواقف نہیں ہوں کہ یہ بلی آپ کے تھیلے میں روز اول سے موجود ہے، لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ تقسیم سے پہلے الٰہ آباد کی شوریٰ کے اجلاس میں، میں نے اِس کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ یاد نہ ہو تو مذکورہ شوریٰ کی روداد پڑھ لیجیے۔ اُس وقت تو یہ مر نہ سکی، لیکن میں اور جماعت کے دوسرے اہل نظر اِس کی فکر میں رہے اور شوریٰ میں اِس کی موت وحیات کا مسئلہ بار بار چھڑتا رہا، یہاں تک کہ تقسیم کے بعد ہم نے جو دستور بنایا، اُس میں اِس کی موت کا آخری فیصلہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ جب اِس کے قتل کا فیصلہ ہوا تھا تو اُس وقت شرع شریف، مصلحت زمانہ اور اسلامی جمہوریت، سب کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہوا تھا۔ اِس کی تائید میں علما کے فیصلے بھی حاصل کیے گئے تھے اور اہل نظر کی رائیں بھی جمع کی گئی تھیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آپ اپنے عمل سے وقتاً فوقتاً اِس کو زندہ بھی کرتے رہے، لیکن ہمارے دستور نے اِس کی زندگی تسلیم نہیں کی۔ اِس سلسلہ میں جب کبھی آپ نے دستور کی مخالفت کی تو عموماً اپنے اقدامات میں بے بصیرتی کا ثبوت دیا جس سے جماعت کے اہل الرائے اِس بارے میں یک سو ہو گئے کہ یہ ''بلی'' مردہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ لیکن آپ پر اِس کی موت بڑی شاق تھی۔ آپ اِس کو حیات تازہ بخشنے کے لیے برابر بے چین رہے۔ اِسی کے عشق میں آپ نے استعفا دیا۔ ماچھی گوٹھ میں آپ نے اِس کے لیے رازداروں کو خلوت میں بلا کر سازش کی۔ پھر کوٹ شیر سنگھ میں اِس پر مسیحائی کا آخری افسوں پڑھا اور یہ واقعی زندہ ہو گئی۔ اب آپ مجھے دعوت دیتے ہیں کہ میں پھر شوریٰ میں آؤں اور اُس کے اندر رہ کر اِس کو مارنے کی کوشش کروں تو میں اِس سے معافی چاہتا ہوں۔ ایک ''بلی'' برسوں کی محنت سے میں نے ماری، آپ نے وہ پھر زندہ کر دی اور اب آپ کی مجلس عاملہ نے اِس کی رضاعت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھالی ہے۔ اب میں پھر اِس کو مارنے میں لگوں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ساری زندگی اِس ''گربہ کشی'' ہی کی نذر کر دوں۔ آخر یہ کون سا شریفانہ پیشہ ہے۔''

تجزیے اور محاکمے کے موقع پر اُن کا اسلوب یہی تھا۔ ''جائزہ کمیٹی'' پر الزامات کے جواب میں مولانا مودودی کو جو خط اُنھوں نے لکھا ہے، وہ اِس کا بہترین نمونہ ہے۔ شام کے سفیر کبیر نے اُسے پڑھا تو اُس پر اپنے قلم سے لکھ دیا: مولانا، آپ نے خط نہیں لکھا، قاضی کا فیصلہ لکھا ہے۔ ''جماعت اسلامی'' پر مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی فرد قرارداد جرم کے جواب میں بھی یہی اسلوب

ہے۔ مولانا مودودی کے نظریۂ حکمت عملی کا تجزیہ بھی اِسی انداز سے ہوا ہے۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرے میں بھی یہی لب ولہجہ ہے۔ اُن کی یہ تحریریں اُن کے طرز انشا کا ایسا نمونہ ہیں کہ آدمی پڑھتا ہے تو اُن کی شوخی طبیعت اور اُن کے سحر طراز قلم کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے اُن کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ وہ لوگ جو ”جماعت اسلامی“ سے تعلق کے زمانے میں اُنھیں سنتے رہے ہیں، آج بھی اُن کی خطابت کو یاد کرتے ہیں۔ بعض سننے والوں نے بتایا ہے کہ وہ خطابت کیا تھی، معلوم ہوتا تھا کہ دریا میں ہلکا ہلکا تلاطم آ گیا ہے، پہاڑوں میں کوئی چشمہ ابل رہا ہے، کوئی ندی ہے جو فراز کوہ سے وادیوں میں اتر کر اب میدانوں کی طرف رواں دواں ہے۔ اُن کی زبان سے جو لفظ بھی نکلتا، سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ وہ پیغمبرانہ اذعان کے ساتھ بولتے اور عہد عتیق کے خطیبوں کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ اُن کی زبان پر استدلال بولتا اور ایمان نازل ہوتا تھا۔ 1945ء میں اُن کی ایک تقریر کا جملہ اِسی کیفیت کا آئینہ دار ہے کہ تم چاہو تو میری گردن پر تلوار رکھ دو، لیکن مجھ سے یہ بات کبھی نہ منوا سکو گے کہ تزکیۂ نفس جیسا پاکیزہ کام اُن جاہلوں کے سپرد کر دوں جو خانقاہوں میں بیٹھے دین فروشی کرتے ہیں۔ ایک نام ور صحافی نے بتایا کہ ککری گراؤنڈ کراچی میں وہ تقریر کر رہے تھے اور میں اُن کی یہ تقریر لکھ رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں اُن کے منہ سے نکلا: ”اسلام فرماتا ہے۔“ وہ لمحے بھر کو رکے اور پھر یہ کہہ کر کہ اِسے غلط نہ سمجھیے، فرمانے کا حق اگر ہے تو صرف اسلام ہی کو ہے، لفظ و معنی کا وہ بحر مواج پیدا کر دیا کہ میں دیکھتا رہا، سنتا رہا اور یہ بھول گیا کہ مجھے یہ سب کچھ لکھنا بھی ہے۔

[باقی]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(12)

باب دوم

شق قمر کا واقعہ ـــــ قرآنِ مجید کی روشنی میں

قرآنِ مجید میں شق قمر کا واقعہ سورۂ قمر (54) کی ابتدائی آیات میں مذکور ہے۔ اِس کی نوعیت اور حقیقت اور غرض و غایت کو جاننے کے لیے اِن آیات کے معانی و مطالب کو سمجھنا ضروری

ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ. وَكَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ. (القمر 54:3-1)

”وہ گھڑی قریب آ گئی، جس سے اِنھیں خبردار کیا جا رہا ہے اور چاند شق ہو گیا۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ (چنانچہ یہی ہوا ہے) اور اِنھوں نے اب بھی جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔ اور (ہم نے اُسی وقت اِن کو نہیں پکڑا، اِس لیے کہ ہمارے ہاں) ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔“

اِس مقام کو جب قرآنِ مجید کے مجموعی مطالب اور نظم کلام کی روشنی میں پڑھا جائے تو درج ذیل باتیں متعین ہوتی ہیں:

1۔ سورہ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذارِ عام میں نازل ہوئی ہے۔ سورہ کا موضوع قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ اِس میں خدا کی دینونت کے ظہور سے استدلال کیا گیا ہے۔

2۔ سورہ کے مضمون سے یہ بھی واضح ہے کہ اِس میں خطاب قریش مکہ سے ہے، جو عذاب کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ درجِ بالا آیات میں ’وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ‘ (اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے) کے الفاظ بھی اِسی بات کی تصریح کرتے ہیں۔

3۔ سورہ میں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم فرعون کی سرگذشتوں کا حوالہ دیا ہے۔ واضح کیا ہے کہ اِن کی طرف اللہ کے رسول مبعوث ہوئے۔ اُن کے ساتھ اللہ نے اپنی نشانیاں بھی نازل فرمائیں، مگر یہ آخر دم تک جھٹلانے ہی پر کمربستہ رہیں۔ لہٰذا اللہ نے اُن پر اپنا عذاب نازل فرمایا۔ قریش مکہ کا معاملہ اِن سے مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ بھی وہی

معاملہ ہو گا، جو سابقہ اقوام کے مجرمین کے ساتھ ہوا تھا۔ اِس بات کو ایک حتمی پیش گوئی کے طور پر ارشاد فرمایا ہے۔ سورہ کی آیت 45 کے الفاظ ہیں:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ. (45:54) ”اِن کا یہ جتھا عنقریب شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں گے۔“

عذاب کی اِس پیش گوئی کے حوالے سے استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

”یہ صریح پیشین گوئی ہے، جو ہجرت سے برسوں پہلے کر دی گئی تھی اور جس طرح کی گئی تھی، حرف بہ حرف اُسی طرح پوری ہو گئی۔ قریش پر اتمام حجت کے بعد یہ منظر پہلی مرتبہ معرکۂ بدر کے موقع پر دیکھا گیا۔ خدا کی افواجِ قاہرہ کے مقابل میں اُن کے جتھے اِس کے بعد کسی میدان میں بھی ٹھیر نہیں سکے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا اور لوگوں نے ہر جگہ اُنھیں اپنی آنکھوں سے پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔“ (البیان 91/5)

4۔ سورہ کا آغاز ’اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ‘ (قیامت کی گھڑی قریب آ گئی) کے الفاظ سے ہوا ہے۔ استاذِ گرامی کے الفاظ میں ’السَّاعَةُ‘ سے یہاں قیامت کی گھڑی مراد ہے، ”جو رسول کے مکذبین کے لیے اُس عذاب سے شروع ہو جاتی ہے، جو اُس کی تکذیب پر اصرار کے نتیجے میں اُن پر لازماً آتا ہے۔“[1] یعنی اُن کے اخروی فیصلے کا نفاذ اِسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور اُن کی سزا بھی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ آخرت میں اُن کا مزید حساب کتاب نہیں ہوتا۔ وہ پہلے دنیوی عذاب جھیلتے ہیں، پھر قبر کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر اُسی کے تسلسل میں دوزخ کا ایندھن بنتے ہیں۔ کفارِ قریش کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ تکذیب اور تکفیر کی اِسی روش پر قائم رہے تو اُن کا انجام بھی یہی ہو گا۔ عنقریب اُن کا فیصلہ صادر ہو جائے گا اور اُن کے سلسلۂ عذاب کا آغاز ہو جائے گا۔

5۔ ’وَانْشَقَّ الْقَمَرُ‘ کے الفاظ چاند کے شق ہونے یا اُس کے پھٹ جانے کے بارے میں بالکل صریح ہیں۔ ’انْشَقَّ‘ ماضی کا فعل ہے، جو کسی عمل کے وقوع اور تکمیل پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی شق ہونے کا فعل واقع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اِس سے آگے متصل آیت بھی اِسی بات کی تاکید و

---

[1]۔ البیان 82/5۔

توثیق کر رہی ہے کہ یہ مستقبل میں ہونے والا کوئی واقعہ[2] نہیں ہے، جسے ابھی ظہور پذیر ہونا ہے، بلکہ ایسا واقعہ ہے، جو واقع ہو چکا ہے۔ اگلی آیت یہ ہے: 'وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ' (اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آرہا ہے)۔

استاذِ گرامی بیان کرتے ہیں:

''وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ'، ''اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آرہا ہے'' کا جملہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ شق قمر کا یہ واقعہ مستقبل کی کوئی خبر نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آنے والا ایک واقعہ ہے، جس سے قرآن نے عذاب اور قیامت کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ اِس لیے کہ 'اِنْشَقَّ الْقَمَرُ' کے معنی اگر یہ کیے جائیں کہ چاند شق ہو جائے گا تو اِس کے بعد یہ جملہ بالکل بے جوڑ ہو جاتا ہے۔'' (البیان 5/ 83)

6۔ اِسی طرح اِسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے کسی زمانے سے بھی منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ آیت 2 سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اِس کے مخاطبین قریش ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ وہ اِس نوعیت کی نشانیوں کو جادو قرار دے کر جھٹلانے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

شق قمر کے واقعے کی نوعیت

شق قمر کو قرآنِ مجید نے 'آیۃ' سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کے معنی و مصداق اور اطلاق و استعمال کے حوالے سے پہلے باب میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ اِس بحث کی نوعیت اگلے مباحث کے فہم میں گویا مقدمے کی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے علم و استدلال اور تحلیل و تجزیہ میں اِسے اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس بنا پر مناسب ہو گا کہ گذشتہ باب کا خلاصہ سامنے رکھ لیا جائے۔

---

[2]۔ بعض علما کے نزدیک یہ مستقبل کے واقعے کا بیان ہے۔ اُن کے خیال میں ماضی کا صیغہ اُس کی قطعیت کو نمایاں کرنے کے لیے آیا ہے۔

یہ چند نکات میں درجِ ذیل ہے:

* 'آیۃ' عربی زبان کا معروف لفظ ہے۔ اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

* یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان ہو تو اِس سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہوتی ہیں، جو اُس کی مختلف صفات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

* قرآنِ مجید جب انسانوں کو اللہ کی صفات کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہے تو وہ اِنھی آیات کو بہ طورِ دلیل پیش کرتا ہے اور اِس طرح اُن کے لیے تذکیر و ترغیب، تہدید و تخویف اور تنبیہ و تعذیب کا سامان کرتا ہے۔

* اِس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآنِ مجید میں چار مختلف مصداقات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ایک، ـــــ انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے ـــــ جو انفس و آفاق میں ظاہر و باہر ہیں اور جن کا تعلق اللہ کی قدرت کے عادی امور سے ہے۔ اللہ کا انسان کو مٹی کے خمیر سے تخلیق کرنا یا سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند کرنا یا آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کے اندر زندگی پیدا کرنا اِسی نوعیت کی آیات ہیں۔

دوسرے، ـــــ انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے ـــــ جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے براہِ راست حکم سے یا کارکنانِ قضاوقدر کے ذریعے سے واقع ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانۂ رسالت میں بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اترنا، صحرائے سینا میں اُن پر مستقل بادلوں کا سایہ رہنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونا اور گہوارے میں کلام کرنا اِسی کی مثالیں ہیں۔

تیسرے، ـــــ انفس و آفاق کی خلافِ معمول ظاہر ہونے والی اُن آیاتِ الٰہی کے لیے ـــــ جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے حکم پر اُس کے نبیوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اِنھی کو مذہبی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہا جاتا ہے۔ اِس کے نظائر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بننا، اُس کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا اور رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر کلام الٰہی کا جاری ہونا شامل ہیں۔

چوتھے، ـــــ انفس و آفاق میں حسبِ معمول اور خلافِ معمول ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی کے لیے ـــــ جو قرآن کے بین الدفتین درج ہیں اور اُس کی سورتوں کے فقروں کے طور پر تلاوت کی جاتی ہیں۔

اِن نکات کی روشنی میں اب سوال یہ ہے کہ سورۂ قمر میں لفظ 'آیۃ' مذکورہ چار اطلاقات میں سے کس اطلاق کو قبول کرتا ہے؟

اگر ہم اِسے قرآن کے جملے یا آیت کے مفہوم میں لینا چاہیں تو ظاہر ہے کہ اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ 'وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ' کا جملہ، بلاشبہ قرآن کی آیت ہے، مگر اِس جملے کے اندر استعمال ہونے والے لفظ 'آیۃ' کا مطلب آیت قرآنی ہرگز نہیں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ قرآن کے کسی فقرے یا بیان کے لیے نہیں، چاند شق ہونے کے واقعے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اِسی طرح اگر اِس کا اطلاق انفس و آفاق کی معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی نشانیوں پر کیا جائے تو یہ بھی درست نہ ہو گا، کیونکہ یہ معمول کا واقعہ نہیں ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے۔ چاند کا طلوع و غروب، اُس کا عروج و محاق، اُس کی ماہِ نو، ماہِ کامل اور ماہِ مشبہ کی مختلف صورتیں، اُس کا جزوی یا مکمل گرہن، اُس کی سرخی، سفیدی اور سیاہی، اُس کی گردش سے مہ و سال کا تعین، اُس کی کشش سے سمندر کا مد و جزر، اُس کی دل کش روشنی اور اُس روشنی میں رات کے مسافروں کے لیے رہنمائی کا سامان، یہ سب اللہ کی آیات ہیں، اُس کی عظیم نشانیاں ہیں، مگر یہ سب روزمرہ اور معمول کے واقعات ہیں۔ اِن کے وقوع میں تسلسل اور تواتر ہے۔ انسان اِن سے مانوس اور مربوط ہوتے ہیں۔ یہ آفاق کی عاداتِ مستمرہ ہیں، خوارقِ عادات نہیں ہیں۔ اِن سب کے برعکس شق قمر ایک خلاف معمول اور خارقِ عادت واقعہ ہے، اِس لیے آیت کے اِس مفہوم کا بھی اِس پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک اُن آیات کا تعلق ہے، جو معجزات و خوارق کی صورت میں انبیا کے توسط سے ظاہر ہوتی ہیں تو اُن کے زمرے میں بھی اِس واقعے کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی نہ آپ نے اپنی زبان سے کوئی الفاظ صادر فرمائے، نہ دستِ مبارک کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کا حکم دیا اور نہ اُس کی جانب کسی چیز

کو پھینکا۔ ایسی کوئی صورت ہوتی تو بلاشبہ، اِس واقعے کا شمار اُن آیات میں ہوتا، جو اللہ کے اذن پر انبیا کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔

اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ اِسے آیاتِ الٰہی کی اُس نوعیت پر محمول کیا جائے، جو خارقِ عادت تو ہے، مگر اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہوئی ہے۔

چنانچہ درست تاویل یہی ہے کہ یہ واقعہ ایسی غیر معمولی نشانی ہے، جو اللہ کے براہِ راست حکم سے ظاہر ہوئی اور اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی اِس کا شمار اُسی طرح کی نشانیوں میں ہوتا ہے، جیسی اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے زمانے میں ظاہر کی گئیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اِسی طرح کی نشانیاں دکھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سورۂ حٰم السجدہ اور سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے۔ حٰم السجدہ میں اعلان فرمایا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ....(53:41)

”(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر، اور یہ بھی متنبہ ہو جائیں)، اِنھیں ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اِن کے اندر بھی، یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے...۔“

سورۂ نمل میں ارشاد ہے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ.(93:27)

”اور کہہ دو کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ عنقریب اپنی نشانیاں تمھیں دکھائے گا اور تم اُنھیں پہچان لو گے اور جو کچھ تم کر رہے ہو، تمھارا رب اُس سے بے خبر نہیں ہے۔“

امام امین احسن اصلاحی نے حٰم السجدہ کے اعلان کو ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مکذبین قرآن کے لیے تہدید و وعید“ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

”مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کو، اُس کے دلائل کی بنیاد پر، ماننے کے لیے تیار نہیں،

بلکہ اُس کی تصدیق کے لیے ہماری نشانیاں ہی دیکھنے پر مصر ہیں تو عنقریب وہ وقت بھی آ رہا ہے، جب مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں، قریش کے اندر بھی، اِس کی حقانیت کی ایسی نشانیاں ظاہر ہوں گی کہ یہ پکار اٹھیں گے کہ بے شک، قرآن بالکل حق ہے۔ 'آیات' سے مراد غلبۂ حق اور ہزیمتِ باطل کے وہ آثار و شواہد ہیں، جن کی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے۔ یہ پیشین گوئی اِس سورہ میں بھی پیچھے تاریخی دلائل کی روشنی میں گزر چکی ہے۔ ابتداءً تو قریش کے لیڈروں نے اِن باتوں کو تعلّی پر محمول کر کے اِن کا مذاق اڑایا، لیکن جب مدینہ میں اور خود مکہ کے اندر اور اُس کے اطراف میں، یہاں تک کہ خود قریش کے اچھے لوگوں کے اندر بھی اسلام جڑ پکڑنے لگا، تب اُن کو اور اُن کے پشت پناہوں کو کچھ تنبہ ہوا۔ بالآخر ہجرت کے بعد غلبۂ اسلام کے ایسے واقعات پیش آئے کہ قریش تو درکنار روم و فارس کے لیے بھی اسلام کے مقابل میں ٹکنا ناممکن ہو گیا۔'' (تدبر قرآن 7/ 129-128)

استاذِ گرامی سورۂ نمل کی مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''یعنی تمھیں پتا چل جائے گا کہ یہ وہی نشانیاں ہیں، جن کے بارے میں میں نے تمھیں خبردار کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہے کہ ہجرت کے بعد یہ سب نشانیاں ظاہر ہو گئیں اور لوگوں نے بہ چشم سر دیکھ لیا کہ خدا کے پیغمبر نے کتنی سچی باتیں بتائی تھیں۔'' (البیان 3/ 581)

چاند کا دو ٹکڑے کرنا، درحقیقت اُسی فیصلے کا اظہار تھا، جس کا اعلان پہلے کر دیا گیا تھا۔ یہ آفاق میں ظاہر ہونے والی نہایت غیر معمولی اور عظیم الشان نشانی تھی۔ اِس کی حیرت انگیزی، اِس کی شان، اِس کے ہول اور اور اِس کے رعب و دبدبے نے اِسے ایک عظیم آیتِ الٰہی کے طور پر نمایاں کیا تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے اِس کا شمار اُن آیات میں ہوتا ہے، جو اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر کی گئی تھیں اور جن میں انبیا کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ گویا یہ اُسی قسم کی نشانیوں میں سے ہے، جیسی اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے زمانے میں ظاہر کی گئیں۔ اِن کی مثالیں من و سلویٰ کا اترنا، بدلیوں کا سایہ فگن ہونا، کوہِ طور کا معلق ہونا، سیدنا مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے تخلیق پانا ہیں۔

[باقی]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

تصوف: ایک متوازی دین

محترم زاہد مغل صاحب کے جواب میں

قرآن مجید میں نبی اور رسول کی اصطلاح مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز اس شخص کے لیے استعمال ہوئی ہے، جو ایک خاص منصبِ ہدایت پر فائز ہوتا اور خدا کی مرضیات سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ اس کی اطاعت اس کے مخاطبین پر فرض ہوتی ہے۔ اسی کا تقاضا ہے کہ اس کا انکار کفر قرار پاتا ہے۔

نبی اور رسول میں ان کی دعوت کے نتائج کے لحاظ سے ایک فرق، البتہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ رسول کی دعوت کے ساتھ زمین ہی پر خدا کی عدالت کا ظہور بھی ہوتا ہے اور اتمام حجت کے بعد قوم کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ دعوت حق کے منکرین اور معاندین سزایاب ہوتے ہیں اور مومنین نجات پاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ.(یونس47:10)

”(اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

نبی اور رسول کے درمیان اس فرق کی بنیاد قرآن مجید کے نصوص ہیں۔ تاہم، نبی اور رسول کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں اور اس لحاظ سے دونوں مترادف ہیں۔

قرآن مجید میں نبیوں کی کوئی اقسام بیان نہیں ہوئیں۔ نبوت عامہ اور نبوت خاصہ، نبوت تشریعی اور نبوت غیر تشریعی کی کوئی تقسیم مذکور نہیں اور نہ ان تقسیمات کے استنباط کے لیے کوئی مضبوط بنیاد ہی دستیاب ہے۔ 'رسول' کی طرح 'نبی' کے لفظ کو لغوی مفہوم میں استعمال کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں، مگر اس سے آگے بڑھ کر نئی اصطلاح بنانا التباس پیدا کرتا اور ایک مفہوم کو دوسرے میں ملانے کی راہ کھولتا ہے۔ اور یہ ہوا بھی۔ نبوت عامہ میں نبوت خاصہ کے خصائص شامل کر دیے گئے۔ یہی نہیں، بلکہ نبوت عامہ کے حامل اولیاے انبیا نبوت خاصہ کے حامل انبیا سے برتر قرار پائے۔ یہ ہونا ہی تھا، کیونکہ انبیا کے ہوتے ہوئے دوسری قسم کے انبیا کا وجود تبھی جواز پا سکتا تھا جب کوئی وجہ امتیاز بتائی جا سکے۔ چنانچہ بتایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا پیغمبر بھی خضر کے در پر پہنچ کر فیضانِ علم سے باریاب ہوتا ہے۔ یہ اولیاے انبیا کائنات کے ستون ہیں۔ نظم کائنات چلانے میں یہ خدا کے ساتھ شامل ہیں۔ خدا کا کوئی تکوینی فیصلہ ان کے علم میں لائے بغیر نہیں ہوتا، بلکہ انھی کے ذریعے سے نافذ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ وہ مقام ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے گروہ، انبیا تمھیں تو بس نبی کا لقب ہی ملا اور ہمیں وہ کچھ ملا جو تمھیں نہیں ملا۔ یہ سب وہ نظریات ہیں جو دوسرے ادیان میں دیوتاؤں اور اوتاروں کے تصور کے ذریعے سے پیش کیے گئے۔ یہاں یہ قطب، ابدال اور غوث وغیرہ کے ناموں سے متعارف کرائے گئے ہیں۔

فنون سے متعلق اصطلاحات انسان بناتے ہیں۔ وہاں یہ اعتراض پیدا نہیں ہوتا یا نہیں ہونا چاہیے کہ مختلف ماہرین فن نے ایک ہی اصطلاح کو دو مختلف مفاہیم میں استعمال کر لیا۔ التباس وہاں بھی پیدا ہوتا ہے، مگر علم کی روایت میں اسے گوارا کیا گیا ہے، التباس کے سبب وضاحت بہر حال وہاں بھی کرنی پڑتی ہے۔ مگر دینی اصطلاحات کی نزاکت کے پیش نظر اصطلاحات کا اشتراک گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً کسی بھی دوسری عبادت یا کسی خاص دعا کو 'الصلوٰۃ'، یعنی نماز نہیں کہا جا سکتا، خواہ لفظ کے لغوی مفہوم، یعنی دعا میں اس کی گنجایش موجود ہو۔ اسی طرح 'نبی' اور 'رسول' کے اصطلاحی مفہوم کے متوازی ایک نئی اصطلاح بنا کر کوئی نیا یا مختلف مفہوم پیدا نہیں کیا جا سکتا، خواہ لغوی معنی میں اس کی گنجایش موجود ہو۔

محترم زاہد مغل صاحب نے صوفیا کی نبوت عامہ کی اصطلاح سازی کے لیے جو جواز پیدا کیے ہیں، ان کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ انھوں نے لفظ 'نبا'، یعنی خبر اور 'نبی'، یعنی حاملِ خبر کے لغوی مفہوم میں گنجایش پا کر ہر چیز جس کی طرف خدا کا امر یا تکوینی الہام ہوا، اسے نبی قرار دے دیا ہے۔ تکوینی نوعیت کے الہامات جو مثلاً شہد کی مکھی کو ہوتے ہیں، غیر متعین قسم کے عمومی الہامات جو گاہ گاہ انسانوں کو ہو جاتے ہیں، سچے خواب جو مسلم اور غیر مسلم، مومن اور مشرک سبھی کو آ جاتے ہیں اور دور نبوت میں نبی کی کسی ضرورت کے تحت فرشتوں کا کسی غیر نبی کو مخاطب کر لینا، جیسا کہ مریم علیہا السلام سے فرشتے کا کلام، جیسے مستثنیٰ واقعات کے مجموعے کو نبوت عامہ کا مفہوم پہنا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کی رو سے ان پر آنے والی وحی کو نبوت کے اجرا کے ثبوت کے طور پر پیش کر کے اسے بھی نبوت عامہ میں شامل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی نبوت خاصہ کے خصائص بھی نبوت عامہ میں منتقل کر دیے۔ مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی ان کی اصطلاحی تقسیم کے مطابق وہ نبوت خاصہ کے حامل ہیں۔ ان کی نبوت کو نبوت عامہ میں کیسے شامل کر دیا گیا؟ یہاں گھپلا کیا گیا ہے۔ یہی وہ درز ہے جس کے ذریعے سے نبوت عامہ سے نبوت خاصہ میں نقب لگائی گئی ہے۔

نبوت عامہ کا سارا قصر درج بالا تخیل پر استوار ہے۔ یہی نکتۂ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ نہ شہد کی مکھی نبی نہ مریم علیہا السلام کو نبیہ کہا گیا۔ مریم علیہا السلام سے نبی کی پیدایش سے متعلق ایک وقتی ضرورت کی وجہ سے مخاطبت کی گئی تھی۔ یہ ضرورت پوری ہو جانے کے بعد پھر مخاطبت نہیں کی گئی۔ استثنائی واقعات سے کوئی عمومی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ غیر متعین الہامات کو نبوت قرار دے دیا جائے تو ہر فکر و فن کے بعض ماہرین نبی قرار پائیں گے، جن کے اپنے میدان تحقیق میں بعض انکشافات الہامی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں میں اس کی بہت سے مثالیں موجود ہیں۔

نبوت عامہ کی اصطلاح سازی کے بعد اب یہ بھی ضروری تھا کہ نبوت عامہ اور نبوت خاصہ میں کوئی فرق اور امتیاز بھی دکھایا جائے۔ اس کے لیے دو معیارات پیش کیے گئے: ایک یہ کہ یہ فرق تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کا ہے۔ نبوت عامہ کا حامل غیر تشریعی نبی ہوتا ہے۔ وہ لوگوں پر کوئی شرعی ذمہ داری عائد نہیں کرتا۔ دوسرا معیار پہلے معیار سے پیدا ہوتا ہے کہ نبوت عامہ کا

حامل خود کو نبی نہ ماننے والوں کی تکفیر نہیں کرتا، اس لیے ان میں سے جو تکفیر کرے، وہ غلط ہے۔ یہاں پہنچ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی الہامی نبوت کا انکار ممکن ہو پاتا ہے، لیکن یہیں سے مرزا قادیانی کا استدلال پیدا ہو جاتا ہے کہ نبی کا انکار اگر کفر ہے تو نبی تشریعی ہو یا غیر تشریعی، اس کا انکار کفر ہی ہو گا۔ بنی اسرائیل میں تشریعی نبی صرف موسیٰ علیہ السلام تھے، مگر منصب رہنمائی پر فائز غیر تشریعی انبیا کا انکار بھی کفر ہی تھا۔ یوں صوفیا اور زاہد مغل صاحب کے استدلال کی ساری پیش کاری، در حقیقت قادیانیت کو استدلال مہیا کرتی ہے۔

جہاں تک تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کی تقسیم کا مسئلہ ہے تو یہ بھی قرآن مجید نے نہیں بتائی۔ قرآن مجید کے مطابق ہر نبی خدا کی ہدایت اور اس کی شریعت کا تابع اور پابند تھا، خواہ یہ شریعت اس کے ذریعے سے دی گئی یا اس سے پہلے کے نبی کے ذریعے سے۔ اس لحاظ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تابع نبی تھے۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ حضرت ابراہیم کی ملت اور گذشتہ انبیا کی ہدایت کی پیروی کریں اور جو شریعت انھیں ملی، وہ اس کے بھی پابند تھے۔

قرآن مجید میں ختم نبوت کے ذکر پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں دراصل بغیر شریعت کے نبی نہ آنے کی نفی بدرجۂ اتم مراد ہے۔ وہ یوں کہ شریعت کی تکمیل کا اعلان تو خود قرآن نے کر دیا تھا۔ اس سے واضح تھا کہ نئی شریعت نہیں آسکتی تھی۔ اب کوئی امکان ہو سکتا تھا تو یہی کہ نبی انذار اور اخلاقی ہدایات اور رہنمائی کے لیے آتے، جیسے کہ بنی اسرائیل میں نزول تورات کے بعد آتے رہے۔ نبیوں کے سلسلے پر مہر لگنے کے اعلان سے انبیا کی آمد کے اس امکان کا خاتمہ ہوا ہے۔

کسی غیر نبی کو خدا سے مخاطبت کا شرف حاصل نہیں۔ نہ غیب کی طرف کوئی کھڑکی کھلتی ہے، جس کے ذریعے سے جب چاہیں، جھانک کر عالم بالا کے احوال معلوم کر لیے جائیں۔ بلکہ نبی کا معاملہ بھی یہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلے کے بارے میں وحی نہ آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے تابی سے منتظر رہتے، مگر ایسا نہ تھا کہ ان کی روح مبارک خود صعود کر کے عالم بالا سے خبر لے آئے۔ صحابۂ کرام کو دینی اور دنیاوی امور میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے حل کے لیے وہ اجتہاد اور مشاورت سے کام لیتے، اس عمل میں ایک دوسرے سے اختلاف اور مباحثہ کرتے، مگر الہام اور کشف کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہ کرتے تھے۔ ایسا کوئی طریقہ ہوتا تو وہ اسے اختیار کرتے۔ صحابہ کے ہاں اس قسم کے خیالات اور دعاوی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ مسلمانوں میں تصوف

اہل عجم کے متصوفانہ حلقوں اور فلسفے کی اشراقی روایت سے در آیا اور انھی کے اوہام کو الہامات کے نام سے مسلمانوں میں رائج کر دیا گیا۔

صوفیا کی اس آزادانہ باطنی سیر کے نتائج دیکھیے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے الہامات اور مکاشفات کا منبع خدا نہیں ہو سکتا۔ یہ دین اسلام کے متوازی تعلیمات کا ایک مجموعہ ہے۔

تصوف میں اصل چیز مشاہدۂ حق ہے، جو باطنی حواس کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے، جب کہ دین میں یہ ایمان بالغیب، یعنی بن دیکھے ایمان ہے، جس کے لیے علم و استدلال کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ دین میں خدا سے تعلق بیم و رجا کا ہے۔ تصوف میں یہ عاشق و معشوق کا ہے۔ اسلام کا منتہاے مقصود بندگی اور عاجزی ہے۔ تصوف میں یہ خدا میں شامل ہو کر خود خدا ہو جانے کا فخر ہے۔ قرآن میں بیان ہونے والی توحید ان کے مطابق عوامی قسم کی ہے۔ صوفیا کو خدا کا عرفان جب حاصل ہوتا تو انھیں معلوم ہوتا کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا وجود موجود ہی نہیں ہے۔ خالق اور مخلوق ایک ہیں۔ ساجد اور مسجود کی دوئی محض وہم ہے۔ توحید کی حقیقت ان کے نزدیک یہی ہے۔ ہندو مت یا سناتن دھرم میں اسے آتما کا پرماتما میں مل جانا کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت 'وحدت الوجود' یا 'ہمہ اوست' کا فلسفہ ہے جو قدیم مصر، یونان اور ہند کے بعض فلاسفہ اور ہندو مت یا سناتن دھرم کے پرچارکوں نے پیش کیا تھا۔ عقیدۂ تثلیث اسی نظریے پر مبنی ہے، جس میں بتایا جاتا ہے کہ خدا نے تین اشخاص میں ظہور کیا۔ اس کی رو سے مسیح علیہ السلام خدا ہی کا جسدی ظہور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فلسفے کو تسلیم نہیں کیا اور اسے کفر اور شرک قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ. (المائدہ، 72:5)

''اُن لوگوں نے بھی یقیناً کفر کیا ہے جنھوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے۔''

ساری کائنات کو خدا کا ظہور مان لینا وہی کفر اور شرک ہے۔ صوفیا کا یہ مشاہدۂ حق اگر کسی حقیقت کا انکشاف ہوتا تو اس میں تضاد اور تخالف نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر صوفیا ایک دوسرے کے نتائجِ کشف کو تسلیم نہیں کرتے۔

تصوف میں انسانِ کامل (روح محمدی) صوفیا میں حلول کر جاتا ہے۔ وحدت الوجود کے نتیجے میں صوفیا پہلے خود خدا ہوئے تھے، اب روح محمدی کے حلول کے بعد نبی بھی ہو گئے۔ خود کو

کمالات نبوت اور نبوت عامہ کا حامل سمجھنے کا منبع یہی خیال ہے۔ اس پر استدلال بعد میں وضع کیا گیا ہے۔ حلول کا یہ عقیدہ بھی خارجی فلسفوں سے در آیا ہے۔ مسیح علیہ السلام میں روحِ خدا کے حلول کا نظریہ اسی کا ایک مظہر ہے، جسے خدا نے تسلیم نہیں کیا اور اسے بھی کفر قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ.
(المائدہ، 73:5)

”اِسی طرح اُن لوگوں نے بھی یقیناً کفر کیا ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے، دراں حالیکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو اِن میں سے جو (پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی) اپنے کفر پر قائم رہیں گے، اُنھیں ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا۔“

خدا تک رسائی پا کر صوفیا خدا سے حصول ہدایت کے لیے نہ نبی کے محتاج رہتے ہیں، نہ فرشتوں کے۔ یہ براہ راست خدا سے ہدایت لیتے ہیں۔ شریعت کی ظاہری پابندی اس لیے کرتے ہیں کہ خدا ہی کی طرف سے انھیں اس کا پابند کیا جاتا ہے، ورنہ خود نبی کے کہنے سے ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ ان کے مطابق شریعت کی پابندیاں اصلاً عوام کے لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کے ہاں ترکِ شریعت یا اس میں تساہل کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ خود کو شریعت کا تابع نہیں سمجھتے، مگر نظم اجتماعی میں خلل یا خوف فساد خلق سے اس پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جو شریعت انھوں نے ایجاد کی ہے، اس کا بھی کوئی شائبہ اسلام میں نہیں ہے۔ چلّے، ریاضتیں، ذکر و اشغال کی کثرت میں خود کو گم کر دینا، اور اس سب کے لیے ترک علائق، یہ رہبانیت ہے جس کی دین مذمت کر چکا ہے۔ دنیا کی خواہشیں اس دینِ صوفیا کے مطابق روح کی آلودگی کا سبب ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ سادگی کو ایک قابل ترجیح قدر کے طور پر اپنانے کی تلقین عام ہوئی۔ اس کے برعکس، قرآن مجید بتاتا ہے کہ دنیا کی زینتیں خدا نے اپنے مومن بندوں کے لیے پیدا کی ہیں تو کون ہے جو ان کو حرام قرار دے؟

ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ‌ؕ قُلۡ هِىَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا خَالِصَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ‌ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ.

(الاعراف 32:7)

”اِن سے پوچھو، (اے پیغمبر)، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے ممنوع ٹھیرایا ہے؟ اِن سے کہو، وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں، (لیکن خدا نے منکروں کو بھی اُن میں شریک کر دیا ہے) اور قیامت کے دن تو خاص اُنھی کے لیے ہوں گی، (منکروں کا اُن میں کوئی حصہ نہ ہو گا)۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔“

ابلیس کی طرف داری اور وکالت کی جسارت بھی تصوف کی راہ سے مسلمانوں کے لٹریچر میں آئی۔ قرآن مجید میں ابلیس کا موقف خود اس کی زبانی نقل ہوا ہے کہ اس کی سرتابی کی وجہ اس کا احساس برتری تھا۔ اس سے جب باز پرس کی گئی تو اس نے کسی ندامت کا مظاہرہ کرنے کے بجاے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ خود تو وہ گم راہ ہوا ہی ہے، اب وہ خدا کے بندوں کو بھی آخری دم تک گم راہ کرتا رہے گا۔

اس کے برعکس، صوفیا کے ہاں وہ ایک سچا موحّد تھا، جو خدا کے سوا کسی دوسرے کے آگے سجدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے لوح محفوظ پر لکھا دیکھا تھا کہ کوئی ایک ایسا ہو گا جو خدا کی نافرمانی کرے گا۔ آدم علیہ السلام کو سجدے کے وقت جب اس نے دیکھا کہ سبھی سربہ سجود ہیں تو اس نے مشیت الٰہی کو غلط ہونے سے بچانے کے لیے خود کو پیش کر دیا اور سجدہ نہ کیا۔ صوفیا کے اس مکاشفے کو مبارک شاہ صاحب نے یوں منظوم کیا ہے:

’اِلّا اِبْلِیْس‘
جس نے مٹّی کے بُت کو نہ سجدہ کیا

روزِ اوّل سے جو مُنکرِ شِرک تھا
جُز ترے جس کی نظروں میں کوئی نہ موجُود تھا
تیرا مردُود تھا؟
جس کے پیشِ نظر تیری تقدیس تھی
کس قدر وُسعت ظرفِ ابلیس تھی
سینۂ آدمی کا ہر اک وسوسہ
جس سے منسُوب ہے
تیرا معشُوب ہے؟
ہے تو ہو گا، مگر مُنصفِ دو جہاں!
اُس کے دِل کی خَلِش کس کے سَر جائے گی
جس نے ہر حال میں تیری لوحِ ازل کا بھرم رکھ لیا
جس نے تیرے لیے بے طلب راستوں پر قدم رکھ لیا

اب قرآن مجید ابلیس کے بارے میں جو کہتا رہے، صوفی کا یقین اس پر ہے جو الہام اور مکاشفے سے منکشف ہوا، اس لیے کہ دین تصوف میں اصل سند قرآن یا نبی نہیں، بلکہ صوفی کا الہام ہے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ابلیس کی براءت کے بارے میں یہ الہام اور مکاشفہ کس کی طرف سے انھیں پیش آیا ہے۔ جنوں اور انسانوں میں اس ربط کے بارے میں قرآن مجید میں مطلع کیا گیا ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ.(الانعام6:128)

”اُس دن کو یاد رکھو، جب وہ اِن سب (مجرموں) کو اکٹھا کرے گا، (پھر فرمائے گا):اے جنوں کے گروہ، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا اور انسانوں میں سے اُن کے ساتھی (فوراً) کہیں گے: پروردگار، ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے سے خوب حظ اٹھایا اور

(آج) اپنی اُس مدت کو پہنچ گئے ہیں جو تو
نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی۔ اللہ
فرمائے گا: اب آگ تمھارا ٹھکانا ہے، تم
اُس میں ہمیشہ رہو گے، مگر جو اللہ چاہے۔
حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار حکیم و
علیم ہے۔''

اہل تصوف سے مکالمہ کے لیے کوئی مشترک علمی اور عقلی بنیاد دستیاب نہیں۔ قرآن کے الفاظ کی ظاہری اور باطنی معانی میں تقسیم کے نظریے سے انھوں نے قرآن سے اپنے لیے باطنی معانی اخذ کرنے کا جواز بنالیا ہے، جو لسانی قواعد کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ یہ ان کی صواب دید ہے جہاں سے جو معنی نکالنا چاہیں، نکال لیں۔ ان سے یہ بات نہیں کی جا سکتی کہ دینی اختلافات میں فیصلہ قرآن سے ہو گا۔ الفاظ اور جملوں کے متبادر معانی ان کے نزدیک محض ظاہری معانی ہوتے ہیں، جب کہ ان کے فیصلے ان کے الہام یا کسی دوسرے صوفی کے الہام پر اعتماد پر مبنی ہوتے ہیں اور اس کی تائید قرآن کے باطنی معانی سے ہوتی ہے، جو صرف ان پر کھلتے ہیں۔

اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیوں تصوف ایک متوازی دین ہے۔ اس کی سند دین محمدی نہیں ہے، باطنیت ہے۔ مسلمانوں میں باطنیت کی یہ تحریک اہل تشیع کے بعض گروہوں میں پیدا ہوئی تھی۔ انھی کی طرف سے یہ خیال بھی تصوف میں رائج ہوا کہ علم تصوف کا منبع حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان سے اِس علم کا صدور عالم روحانیت میں کہیں ہوا، اس لیے اس واقعہ کی کوئی سند بھی طلب نہیں کی جا سکتی ہے اور نہ اسے تلاش کرنا ممکن ہے۔

تصوف بادشاہت کے متوازی ایک روحانی بادشاہت کا خیالی جہان بھی ہے۔ مسلمانوں میں بادشاہ کے لیے رائج لقب، خلیفہ انھوں نے اسی وجہ سے اختیار کیا۔ ایک مخصوص علاقے میں ان کی روحانی بادشاہت یا خلافت قائم ہوتی ہے۔ پھر خلفا کی طرح ہی خلعت خلافت دے کر یہ اپنے نائبین مختلف علاقوں میں تعینات کرتے ہیں، جو ان کے خلیفہ کہلاتے، ان کی روحانی سلطنت کو پھیلاتے اور مضبوط کرتے ہیں۔ ان نائبین سے یہ خفا ہو جائیں تو خلعت خلافت چھین کر انھیں معزول بھی کر دیتے ہیں۔ اپنی روحانی سلطنت کا تاثر انھوں نے اس طرح مضبوط کیا ہے کہ

حکمران اور سیاسی زعما بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی سلطنت کی سند یا حکومت کے حصول اور بقا کے لیے ان کے آشیر بادیا دعاؤں کے لیے ان کے در پر حاضری دیتے رہے۔

عام لوگوں کے نزدیک تصوف اصلاحِ باطن یا اصلاحِ اخلاق کا ایک ادارہ اور ذریعہ ہے، لیکن اپنی اصل میں یہ کچھ اور شے ہے۔ یہاں مرشد کی ذات، اس کا حکم اور اس کی تعبیرات دین کا ماخذ ہیں۔ اس کا حکم خلاف دین بھی معلوم ہو تو بجالایا جائے گا۔

اصلاح تصوف کی تمام تحریکیں ظاہری طور پر شریعت کی پابندی کی تلقین تک محدود ہی رہ سکتی ہیں، نظریاتی سطح پر کوئی تبدیلی اس میں ممکن نہیں، ورنہ تصوف کی عمارت ڈھے جائے گی۔

محمد ذکوان ندوی

مشینی کلچر کا سیلاب

موجودہ زمانے کے مشینی کلچر نے عام طور پر دورِ جدید کے انسانوں کو 'ترقی' دے کر اُنھیں انسان سے 'غیر انسان' بنادیا ہے۔ ایمان اور اخلاق پر ثابت قدم رہنے والے ایک 'گروہِ قلیل'[1] کو چھوڑ کر، لوگوں کی اکثریت[2] اب اِسی عام فساد کا شکار ہوچکی ہے۔ چنانچہ اب نہ اُس کے اندر ربانیت باقی رہی اور نہ انسانیت زندہ ہے۔ مشینی انقلاب کے اِس سنگین ترین پہلو کو اقبال جیسے 'دانائے راز' نے اُس کے آغاز ہی میں دریافت کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کہا تھا:

ہے دل کے لیے موت، مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں، آلات!

اقبال کے ایک شعر کو اکثر میں ایک لطیف ترمیم کے ساتھ اِس طرح پڑھتا ہوں:

کیا ہے تجھ کو 'مشینوں' نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا، تجھ کو بوے گل کا سراغ

جدید حالات کی نسبت سے، ٹیکنالوجی کا مثبت استعمال ایک الگ چیز ہے اور مشینی کلچر کا طوفانی سیلاب بالکل ایک دوسری چیز۔ جدید ٹیکنالوجی کے معاملے میں ہمارا اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہم ٹیکنالوجی کو استعمال کریں، ٹیکنالوجی ہم کو ہرگز استعمال نہ کرے۔

---

[1]۔ سبا 34:20۔

[2]۔ الفرقان 25:44۔

تاہم موجودہ زمانے کا بحران یہ ہے کہ اِس مشینی کلچر نے انسان کو پوری طرح ایک مشینی حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ جدید آدمی اب عموماً آدمی نہیں رہا، بلکہ وہ 'غیر آدمی' بن کر تمام انسانی اوصاف اور ربانی احساسات سے عاری ہو کر ایک بے روح انسانی روبوٹ بن کر رہ گیا ہے۔

آئی ٹی سیکٹر کے ایک مسلم ایکسپرٹ سے 'مشینی ذہانت' (AI) پر گفتگو کرتے ہوئے ایک بار راقم نے کہا تھا کہ پہلے اِن ظالموں نے انسان کو مشین بنایا، اور جب انسان پوری طرح مشین بن گیا تو اب یہی لوگ 'مشینی ذہانت' کے ذریعے سے خود مشین کو انسان بنانے کی ناکام جد وجہد کر رہے ہیں۔

واقعات بتا رہے ہیں کہ ایسی حالت میں، بس ایک 'متاعِ غرور'[3] کی قیمت پر عملاً نہ صرف 'غیر انسانوں' میں اضافہ ہو گا، بلکہ خود انسان جیسا خدائی شاہ کار صرف مشینوں کا غلام بن کر محض ایک تابع فرمان کلرک کی حیثیت سے کام کرے اور تمام انسانی صلاحیتوں سے محروم ہو کر رہ جائے، جیسا کہ عملاً اب یہ ظاہرہ 'ہر ترقی یافتہ' اور 'متمدن' مقامات پر عام ہو چکا ہے۔

مشہور سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ[4] (Stephen Hawking) نے اِس خطرے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ 'مشینی ذہانت' کا یہ لامتناہی ارتقا خود انسانی نسل کے خاتمے کی قیمت پر ہو گا:

> The development of full artificial intelligence could spell the end of the human race. [The Economic Times, March 14, 2018]

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) نے اپنے اِسی مذکورہ بیان کے تحت گفتگو کرتے ہوئے مزید کہا کہ اب اِس معاملے میں ہم اُس پوائنٹ تک پہنچ چکے ہیں، جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ چنانچہ اب ہم گویا خود اپنے خنجر سے اپنی خودکشی کے راستے کی طرف بڑھ رہے ہیں:

> I believe we have reached the point of no return...

---

[3] ۔الحدید 20:57۔

[4] ۔وفات: 2018ء۔

and we are in danger of self destructing.

شاعر حقیقت ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم نے آج سے ایک صدی قبل 'بانگِ درا' (1905ء) میں اِس کی پیشین گوئی کرتے ہوئے درست طور پر فرمایا تھا:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا!

مشہور سائنس دان آئن سٹائن[5] نے اِس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایک دن وہ آئے گا، جب بالآخر یہ جدید ٹیکنالوجی انسانی دنیا پر قابو پالے، اور ہماری یہ دنیا صرف احمقوں کا ایک مسکن بن کر رہ جائے:

I fear the day when the technology overlaps with our humanity. The world will only have a generation of idiots. [Albert Einstein]

اِسی طرح، مشہور امریکی مصنف ایرک ہولڈ مین (Eric Holdman) نے کہا کہ ٹیکنالوجی پر اِس قدر انحصار نئی نسل کو اچھی تحریر اور انسانی روابط جیسی انسانی صلاحیتوں سے محروم کرتا جارہا ہے:

The generation of young people now entering the workplace, don't know how to communicate. They are poor writers and their coordination and collaboration skills are lacking. Some of this would have to be a direct result being wedded to their "digital assistants". [govtech.com]

مشینی کلچر کے سیلاب کا یہ ظاہرہ بلاشبہ، انسانیت کے لیے ایک انتہائی مہلک ظاہرہ تھا۔ مشین کو مشین کے درجے پر رکھنا چاہیے تھا، اور انسان کو انسان کے مقام پر۔ انسان کو خدا نے 'انسان' بنایا تھا، لہٰذا، اِس خدائی اسکیم کے مطابق، اُسے ہر حال میں 'انسان' رہنا چاہیے؛ خواہ 'ترقی' کا یہ تیز و تند طوفان اُس کے اِس ربانی چراغ کو کتنا ہی زیادہ بجھانے کی کوشش کیوں نہ کرے۔

---

[5]۔ وفات: 1955ء۔

موجودہ زمانے میں 'بجلی' کی روشنی کے باوجود اِس قسم کا 'اندھیر' بہت تیزی کے ساتھ تقریباً تمام 'ترقی یافتہ' مقامات پر جاری ہے۔ اکبر الٰہ آبادی[6] نے اِس ظاہرے پر اپنے مخصوص اسلوب میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے رکھنا
روشنی آتی ہے، اور نور چلا جاتا ہے!

تاہم، بلاشبہ یہ انسانیت کا ایک سنگین اور ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا کہ 'ہوائے ترقی' کے اِس طوفان میں خود انسان کا نورِ فطرت اور روشن چراغِ دل بجھ کر رہ جائے، کیونکہ یہ دل کی زندگی اور حساسیت ہی ہے جس کا نام زندگی اور ایمان ہے۔ دل کی اِس زندگی، حیویت، دردمندی اور حساسیت کے بغیر انسان انسان نہیں۔ خواجہ میر درد دہلوی (وفات: 1758ء) نے بجا طور پر کہا تھا:

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے، تیرے جینے سے!

آج کل عام طور پر ہر طرف اِس مشینی کلچر کے فضائل و برکات کا چرچا ہو رہا ہے۔ ہر جگہ اِسی فکر کی چھاپ اور اِسی تہذیب کا غلبہ ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی، دونوں قسم کے لوگ اِس کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اِسے ایک 'خیر مطلق' (summum bonum) قرار دے رہے ہیں۔

اِس قسم کے چند افراد سے گفتگو کرتے ہوئے ایک بار راقم نے اِن جدید 'برکات' کے متعلق کہا تھا کہ اِن 'برکات' کا حال یہ ہے کہ اِن کے ظہور سے پہلے چراغ کی روشنی میں جو کچھ روشنائی سے لکھ دیا گیا تھا، اب ہم بجلی کی روشنی اور ڈیجیٹل سیاہی میں اُسے پڑھنے کا یارا بھی نہیں رکھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف مادّی چمک دمک اور ٹیکنیکل کمالات کسی چیز کے 'خیر مطلق' ہونے کا معیار ہرگز نہیں بن سکتے۔ مادّی طرزِ فکر اور خالص مادہ پرستانہ تصورِ حیات پر مبنی یہ وہی یک چشمی اور اندھا پن (one-sided approach) ہے جسے فتنۂ دجالِ اکبر کے تحت، ایک قولِ رسول میں 'أَعْوَرُ العَيْن'[7] کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی بے بصیرتی اور اندھا پن۔

---

[6]۔ وفات: 1921ء۔

[7]۔ مسلم، رقم 169۔

اصل یہ ہے کہ کوئی ظاہرہ صرف اُسی وقت 'خیر مطلق' کا درجہ پاسکتا ہے جب وہ ایمان و اخلاق کا ضامن اور خدا پرستی و انسانی ہم دردی سے معمور ہو۔ ایسی حالت میں، اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مادّی ترقیات کے اِس سیلاب میں خود انسان نے اوّلین درجہ حاصل کیا ہے یا وہ صرف ایک ثانوی وجود بن کر رہ گیا ہے؟ اُس کے قلبی اور روحانی سکون میں اضافہ ہوا ہے یا وہ اب محض ایک قسم کے ذہنی 'تَخَبُّط'[8] اور فکری اضمحلال کا شکار ہے؟ کیا اُس کے پاس خود اپنے لیے وقت باقی رہا ہے یا نہیں؟

ایسی حالت میں ہمیں رک کر غور کرنا چاہیے کہ اِن جدید ترقیات کی صورت میں انسان نے جو کچھ پایا ہے، کہیں وہ خود اپنی آدمیت کی قیمت پر تو اُسے نہیں ملا؟ انسانیت اور اقدار (values) جو اصل انسانی جوہر ہیں، وہ زندہ ہیں یا اُن کا خاتمہ ہو چکا ہے؟ اکبر الٰہ آبادی نے درست طور پر کہا تھا:

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے!

واقعاتی اعتبار سے دیکھیے تو اِن سب باتوں کا جواب تقریباً نفی میں ملے گا۔ اگر ایک شخص چشم بصیرت سے دیکھے تو یہ سب کچھ ایک ایسا نوشتۂ دیوار بن چکا ہے، جسے اب ہر جگہ سر کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک عام آدمی بھی انتہائی شدت کے ساتھ اِن جاں گسل واقعات کا تجربہ کر رہا ہے۔

تجربات شاہد ہیں کہ عمومی جذبۂ انسانیت بھی اب بہ تدریج نہ صرف کم، بلکہ ناپید ہوتا جارہا ہے۔ بے روح مذہبی مراسم نے خاشعانہ عبادت کی، اور رسوم و آداب کے رسمی مظاہر نے اب اخلاقیات کی صورت اختیار کرلی ہے۔ عام طور پر اب اِنھی مراسم کی ادائیگی کو دین و انسانیت کا اصل معیار سمجھ کر ایمان واخلاق کی اہمیت کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ بے روح قسم کے ڈیجیٹل اور پروفیشنل آداب (etiquettes) کو اُس زندہ اسلامی اور ربانی اخلاقیات کے ہم معنی قرار دے دیا گیا ہے جو خوفِ خدا، حسن اخلاق اور حقیقی انسانی ہم دردی سے عبارت تھا۔

کورونا کے بحرانی فساد نے اب بچے کھچے انسانوں کو بھی 'غیر انسان' بنا کر اپنے مطلوب معیارات

---

[8] ۔ البقرہ 2:275۔

پر کامل سحر کاری اور تاجرانہ عیاری کے تحت آن لائن اور ڈیجیٹل صورت میں انتہائی خوب صورتی کے ساتھ قائم کر دیا ہے۔ آج کا انسان قبل از کورونا جیسا انسان نہیں رہا، بلکہ وہ اب اپنے انسانی احساسات اور انسانی تعلقات کے اعتبار سے، پوری طرح ایک بدلا ہوا انسان دکھائی دے رہا ہے۔

چنانچہ وقت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اچھے لوگ نہ صرف یہ کہ اب بہ تدریج کم سے کم ہوتے جارہے ہیں، بلکہ غیر حساس آدمیوں کی بھیڑ اور اُن کی طرف سے مسلسل 'غیر انسانی' تجربات کی بنا پر اچھے اور درد مند لوگ بھی اب بدلتے اور گویا "نمک کی کان میں نمک" ہوتے جا رہے ہیں۔ اِس طرح کے اکثر افراد اب ماحول کے زیر اثر اپنے خول میں بند ہو کر اپنے آپ کو سمیٹنے اور خاموش رکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں، بلکہ یہ قربِ قیامت کا ایک ہول ناک ظاہرہ ہے۔

خلاصۂ کلام

ایسی حالت میں ضروری ہے کہ آدمی نما افراد کے اِس انبوہِ کثیر میں چند باقی ماندہ 'انسان' ہر گز دل شکستہ نہ ہوں، بلکہ حسبِ احوال، وہ ہر سطحِ حیات پر فطرت سے قریب رہنے کی جدوجہد کریں، وہ انسانیت کے اِس گھٹاٹوپ اندھیرے میں خدا کی یاد کو اپنا سہارا بنائیں، وہ خدا کے سچے بندوں کی مدد سے ایمان اور اخلاق کا ربانی چراغ مسلسل جلاتے رہیں، وہ صدق دل سے انسانوں کی بے لوث خدمت، اُن کی رہنمائی و خیر خواہی اور اُن کا ہر ممکن تعاون جاری رکھیں۔

اِن حالات میں ہمارا حال اُس مردِ درویش کے مانند ہونا چاہیے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ:

ہوا ہے گو تند و تیز، مگر چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو خدا نے دیے ہیں، اندازِ خسروانہ

باطل کی مدت تھوڑی اور بہت تھوڑی ہے۔ اُس کا انجام فنا و زوال کے سوا اور کچھ نہیں 'اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً'۔ اِس کے برعکس، بقا و دوام صرف حق و صداقت کے لیے مقدر ہے، لہٰذا اہل حق کو گھبرانے اور مایوس ہونے کی ہر گز کوئی ضرورت نہیں:

'وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنتمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ' (آلِ عمران 3:139) یعنی تم مطمئن

رہو، تمھیں ہر گز حوصلہ کھونے اور غم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم (سچے) مومن ہو تو (اصل) غلبہ واقتدار بالآخر تمھارا مقدر بن کر رہے گا۔

سید منظور الحسن

فکرِ غامدی پر تنقید کیسے کریں؟

[جناب محمد دین جوہر کی تحریر کے تناظر میں]

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے افکار پر نقد و جرح کا سلسلہ جاری ہے۔ کم و بیش نصف صدی پر محیط اِس مشق سخن کی نوعیت تاحال سعی لاحاصل کی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فاضل ناقدین نے اُن علمی، عقلی اور اخلاقی اصولوں کو اختیار نہیں کیا، جو تنقید کے اجزاے لازم کے طور پر مسلم ہیں۔ اُنھوں نے عموماً نتائج کو ہدف بنایا ہے، اُن کے پیچھے کار فرما دلائل پر جرح نہیں کی۔ اگر کہیں دلائل کا ذکر کیا ہے تو بر سبیل تنزل کیا ہے اور اُس میں بھی اُنھیں اپنے زاویۂ استدلال کی منطق سے رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُسی طرح، جیسے مثال کے طور پر کسی سائنسی بیان کو ادبی اسلوب نگارش پر پرکھا جائے یا کسی ادبی جملے کا سائنسی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ اِس پر مستزاد جذبات اور تاثرات کی شدت ہے۔ الزام تراشی، دشنام طرازی، دروغ گوئی اور فتویٰ بازی اِسی کے مختلف مظاہر ہیں۔ گویا:

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اہل تنقید کے لیے کم از کم سنجیدہ علمی حلقوں میں نقصِ اعتبار کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ علم و فکر کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ فاضل دانش ور جناب محمد دین جوہر نے

اِس نقصان کا احساس کیا ہے اور فکرِ غامدی پر درست خطوط میں تنقیدی مباحث لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ یہ نہایت مثبت قدم ہے۔ اُن کے اِس اقدام کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اللہ اُنھیں ہمت و حوصلہ اور صحت و سلامتی عطا فرمائے۔ آمین۔

علم کے ارتقا اور استحکام کے لیے تنقید ناگزیر ہے۔ اِس کے بغیر کوئی علمی کاوش منقح اور مفید نہیں ہو سکتی۔ تنقید اُس کی تراش خراش اور تہذیب و تالیف میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اِس طرح علم کی خدمت کا گراں قدر فریضہ انجام دیتی ہے۔ جلیل القدر اہل علم اِسے اپنے لیے نعمت سمجھتے اور ہر وقت اِس کے طلب گار رہتے ہیں۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ وہ ہر دم مشتاق رہتے ہیں کہ اہل علم اُن کے موقف کو چیلنج کریں، اُس کی غلطی کو واضح کریں، اُس کی کجی کو نمایاں کریں، اُس کے خلا کو متعین کریں۔ یہ کام وہ خود بھی پوری شدت کے ساتھ کرتے ہیں اور اپنے رفقا اور تلامذہ کو بھی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اُن کے افکار کو بلا جھجک ہدفِ تنقید بنائیں۔

محمد دین جوہر صاحب کے مذکورہ ارادے میں خوش آیند امر یہ ہے کہ اُنھوں نے تنقید کو خالص علمی اسلوب پر مرتکز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھا ہے:

”... جذبات کے بغیر میں فکرِ غامدی پر گفتگو کا ارادہ رکھتا ہوں...

... سب سے پہلے ہم ان کے اصول و مبادی کو دیکھیں گے۔“

یہ دونوں باتیں صحت مند تنقید کے لیے ناگزیر ہیں۔ جذبات مثبت ہوں یا منفی، تنقید کی روح کو مجروح کرتے ہیں، اِس لیے اُن سے احتراز ضروری ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی فکر کچھ اصول و مبادی پر استوار ہے تو اُس کی تغلیط کے لیے اُن اصول و مبادی کی تغلیط لازم ہے۔

اِن دو باتوں کے علاوہ، خاص فکرِ غامدی کے تناظر میں، درجِ ذیل تین چیزوں کا لحاظ بھی ضروری ہے:

ایک یہ کہ فکر غامدی کا دائرہ 'معارفِ اسلامی' ہے۔ اِس دائرے کا اپنا پس منظر، اپنی روایت، اپنے دلائل، اپنے حقائق، اپنے مسلمات، اپنی اصطلاحات اور اپنی ہرمینیٹکس (Hermeneutics) ہیں۔ ناقدین کے لیے لازم ہے کہ وہ اِس دائرے کے اندر کھڑے ہو کر اپنی تنقید پیش کریں۔ وہ اگر اِس سے مجرد ہو کر یا کسی اور دائرے ـــ مثلاً فلسفہ، علم کلام، تصوف، سائنس ـــ میں کھڑے

ہو کر طبع آزمائی کرتے ہیں تو اِس کی حیثیت خود کلامی کی ہو گی۔ اِسے تنقید کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکے گا۔

دوسرے یہ کہ فکرِ غامدی متن کی صورت میں دستیاب ہے۔ صاحبِ فکر کی تصانیف ''البیان''، ''میزان'' اور ''مقامات'' میں اُس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن میں اصول بھی ہیں، فروع بھی ہیں، توضیحات بھی ہیں، اطلاقات بھی ہیں، یہاں تک کہ اجتہادات بھی ہیں۔ گویا پورا نظام فکر جملہ اجزا کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نقل ہے۔ اِس کے بعد ناقدین کے پاس اِس امر کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ وہ فکر کی تغلیط کے لیے متن کے علاوہ کسی اور جانب رجوع کریں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اُن کی تنقید علم کی دنیا میں باریابی حاصل نہیں کر سکے گی۔

تیسرے یہ کہ فکرِ غامدی نے معارفِ اسلامی کی فکری روایت میں نقد و جرح، تحقیق و تنقیح اور تجدید و اصلاح کا جو کام کیا ہے، اُس کا فہم ناگزیر ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ آیا اُس کی نوعیت ری کنسٹرکشن آف ریلیجن (Reconstruction of Religion) کی ہے یا ری کنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹ (Reconstruction of Religious Thought) کی ہے؟ اِس تناظر میں جن مباحث کو گہرائی سے سمجھنا ضروری ہے، ان میں یہ موضوعات نمایاں ہیں: ''نظمِ قرآن''، ''قرآن کی زبان کی ابانت''، ''قرآن کی دین کی آخری کتاب ہونے کی نوعیت''، ''نبوت و رسالت میں فرق''، ''حدیث و سنت میں فرق''، ''اجماع و تواتر''، ''دین کا مقصد: تزکیۂ نفس''، ''احکامِ شریعت کے علل اور اُن کے فقہی فروع''۔ ناقدین کے لیے اِن مباحث سے اتفاق ضروری نہیں، مگر اِن کا فہم ضروری ہے۔ کسی فکر کے صحیح فہم کے بغیر اُس پر سطحی تبصرے تو کیے جا سکتے ہیں، ٹھوس علمی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

نوا پیرا ہوں شاید اِس سے تیرا دل بدل جائے
مرے نغموں سے یہ آشفتۂ محمل بدل جائے

ریحان احمد یوسفی

مغرب اور آج کا چیلنج

مرزا غالب (1797ء-1869ء) اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی عظمت کا راز صرف ان کی شاعری کے حسن اور بیان کی خوبی ہی میں نہیں ہے، ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر سمجھتے ہیں اور بڑی سادگی سے عام لوگوں کے لیے بیان کر دیتے ہیں۔ غالب جس پر آشوب دور میں پیدا ہوئے، اس میں انھوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو برباد ہوتے ہوئے اور باہر سے آئی ہوئی انگریز قوم کو ملک کے اقتدار پر چھاتے ہوئے دیکھا۔ غالباً یہی وہ پس منظر ہے جس نے ان کی نظر میں گہرائی اور فکر میں وسعت پیدا کی۔

تاہم بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ غالب نے ایک ایسے پہلو سے مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی، جو اگر مسلمان اختیار کر لیتے تو آج دنیا کی عظیم ترین قوتوں میں ان کا شمار ہوتا۔ مگر بد قسمتی سے لوگوں نے شاعری میں ان کے کمالات اور نثر پر ان کے احسانات کو تو لیا، مگر قومی معاملات میں ان کی رہنمائی کو نظر انداز کر دیا۔ اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ یہ کام اس شخص نے کیا جو خود آنے والے دنوں میں برصغیر کے مسلمانوں کا بہت بڑا رہنما بنا، یعنی سر سید احمد خان۔

1855ء میں سر سید نے اکبر اعظم کے زمانے کی مشہور تصنیف ”آئین اکبری“ کی تصحیح کر کے

اسے دوبارہ شائع کیا۔ غالب نے اس پر فارسی میں ایک منظوم تقریظ (تعارف) لکھی۔ اس میں انھوں نے سرسید کو سمجھایا کہ ”مردہ پرورن مبارک کارِ نیست“، یعنی مردہ پرستی اچھا شغل نہیں، بلکہ انھیں انگریزوں سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ وہ کس طرح فطرت کی طاقتوں کو مسخر کر کے اپنے اجداد سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ انھوں نے اس پوری تقریظ میں انگریزوں کی ثقافت کی تعریف میں کچھ نہیں کہا، بلکہ ان کی سائنسی دریافتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختلف مثالوں سے یہ بتایا ہے کہ یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

بدقسمتی سے اس نصیحت کو سرسید نہ سمجھ سکے۔ وہ انگریزوں سے متاثر تو ضرور ہوئے، مگر سائنس و ٹیکنالوجی میں ان کی ترقی سرسید کا آئیڈیل نہ بنی۔ بلکہ انگریزوں کی زبان، ان کی معاشرت، ان کے سماجی علوم یہی سرسید کے نزدیک مسلمانوں کے لیے کامل نمونہ تھے۔ اِنھی کی تحصیل کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو ابھارا اور اسی مقصد کے لیے ایک زبردست تعلیمی تحریک برپا کی۔ اس کا یہ فائدہ تو بہرحال ہوا کہ مسلمان اس قابل ہو گئے کہ انگریزی معاشرے کے دیگر نظاموں کے ساتھ ان کے نظام سیاست کو سمجھ کر ان سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، مگر بدقسمتی سے اس کے اثرات تہذیبی اور ثقافتی طور پر ان پر بہت برے پڑے۔ مسلم اشرافیہ (elite) میں انگریزوں کی زبان، لباس، ثقافت، رہن سہن اور اقدار سے مرعوبیت کی نفسیات پیدا ہو گئی۔ بدقسمتی سے آج کے دن تک ہمارے پڑھے لکھے اور صاحب ثروت طبقات اسی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلو، مثلاً قانون کی عمل داری، سماجی عدل، تحریر و تقریر کی آزادی کا تو چلن ہمارے ہاں آج تک نہیں ہو سکا، البتہ انگریزی زبان اور انگریزی طرز زندگی ہمارے ہاں عزت و شرف کا معیار سمجھے جاتے ہیں۔

اس صورت حال میں مزید خرابی ہماری مذہبی قیادت نے پیدا کی ہے۔ انھوں نے شروع ہی سے سرسید سے متضاد طرز فکر اختیار کیا، یعنی انگریزوں اور انگریزی تہذیب کے ہر پہلو سے شدید نفرت۔ سرد جنگ کے زمانے میں سیاسی حالات کی بنا پر یہ رویہ کچھ بہتر ہوا تھا، مگر 11/9 کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے نتیجے میں ایک دفعہ پھر اس ذہنیت کا بھرپور اظہار ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے لیے درست راستہ اس وقت صرف یہ ہے کہ وہ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ایک درمیانی راستہ اختیار کریں۔ انھیں نہ مغرب سے مرعوب ہونا ہے اور نہ اس سے نفرت کرنی

ہے۔ اس وقت مغرب دنیا کا حکمران ہے۔ ان کی تہذیب دنیا کی غالب تہذیب ہے۔ وہ سائنس و ٹیکنالوجی کے امام ہیں۔ ان کی اس اہمیت کی بنا پر ان کے ساتھ بڑے تدبر کے ساتھ معاملہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے تین پہلو ہیں: ایک یہ کہ سائنسی علوم اور تمدنی ارتقا میں ان کی ترقی کو کلی طور پر لینا ہمارا نصب العین ہونا چاہیے۔ دوسرے، ان کی تہذیب کے وہ پہلو جو ہماری بنیادی اقدار کے خلاف ہیں، ان کو ہر صورت میں اپنے اندر درآنے سے روکنا ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ مثلاً ہماری تہذیب آخرت پسندی، حیا اور حفظ مراتب کے ارکان ثلاثہ پر کھڑی ہے۔ ان پر ہم کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ تیسرے، ان کے درمیان میں جو ثقافتی عناصر ہیں، مثلاً زبان وغیرہ ان پر سمجھوتا کرنا ہماری مجبوری ہے۔ اس حکمت عملی کو اپنائے بغیر ہم اس چیلنج کا سامنا موثر طریقے سے نہیں کر سکتے جو آج ہمیں درپیش ہے۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(11)

[صاحب ”تدبر قرآن“ کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

مولانا اصلاحی کی جماعت اسلامی میں شمولیت کا واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ مگر وہ 1941ء سے لے کر 1958ء تک جماعت کا سرگرم حصہ رہے۔ اس دوران میں وہ زیادہ تر جماعت کے نائب امیر کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ جوانی کے سترہ برس انھوں نے جماعت پر نچھاور کر دیے۔ بظاہر یہ بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ایک حادثے پر ان کی زندگی کے سترہ برس اور وہ بھی جوانی کا زمانہ خرچ ہو گیا۔ مولانا نے اپنی زندگی کے اس حصے پر بہت گفتگو کی ہے۔ اس موضوع پر خاص طور پر اپنا موقف ریکارڈ کرایا۔ اس پر مختلف انٹرویوز میں بھی تبصرے کیے۔ ہم ان کی انھیں یادداشتوں کو سامنے رکھتے ہوئے، جنھیں انھوں نے اپنی سوانح عمری کے لیے بطور خاص ریکارڈ کرایا تھا، اس واقعے کا تین جہتوں سے مطالعہ کریں گے۔ اس سے یہ بات آشکار ہو گی کہ وہ اسے ”حادثہ“ کیوں قرار دیتے

ہیں اور اس پر ایک طرح سے معذرت خواہانہ رویہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔

مولانا مودودی پر تنقید اور ان کا اتفاق

یہ ''الاصلاح'' کے زمانے (39-1938ء) کی بات ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنے پرچے ''ترجمان القرآن'' میں ہندستان میں مسئلۂ قومیت کو موضوع بنایا۔ یاد رہے، یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جنگ عظیم دوم کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ کانگرس ایک ملک گیر سیاسی جماعت کا روپ دھار چکی تھی۔ وہ انگریزوں سے ہندستان کی آزادی کا مطالبہ کر چکی تھی۔ اس مطالبے میں مسلمان بڑی تیزی سے دو حصوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ کچھ سمجھتے تھے کہ انھیں کانگرس کا ساتھ دینا چاہیے اور کچھ انھیں سمجھاتے کہ انھیں بطور مسلمان اپنا تشخص علیحدہ رکھنا چاہیے اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر پہلے خود کو متحد کرنا چاہیے۔ اس صورت حال پر مولانا اصلاحی نے تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا، وہ کم و بیش انھی کے الفاظ میں اس طرح ہے:

> ''جماعت اسلامی کے قیام سے قبل جب مولانا مودودی صاحب حیدر آباد سے پرچہ نکال رہے تھے، تو انھوں نے اس میں مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ متحدہ قومیت پر تنقید شروع کی۔ میں نے آغاز میں اس تنقید سے اتفاق کیا اور مودودی صاحب کے اسلوب سے بھی متاثر ہوا... اب مودودی صاحب جب لکھتے تھے تو پڑھا لکھا متاثر تو ہوتا ہی تھا۔ لیکن وہ جلد ہی مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی حمایت میں لکھنے لگے۔ یہاں تک کہ ترنگ میں آکر یہ لکھ گئے کہ ایک طرف وہ حضرات ہیں جو علما کہلاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ متحدہ قومیت کا پرچار کر رہے ہیں اور دوسری طرف اللہ کا ایک بندہ ہے جو 'کونوا عباد اللہ' کی دعوت دے رہا ہے۔ یعنی قائد اعظم صاحب! یہ جب انھوں نے لکھا تو مجھے بہت سخت ناپسند ہوا۔ میں نے اس کے جواب میں ایک مضمون لکھا... واقعہ تو یہ ہے کہ میرے سارے مضامین اس زمانے میں مولانا مودودی ہی کے بارے میں ہوتے تھے، لیکن پبلک میں میرا یہ مضمون زیادہ پڑھا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جو کاوش آپ متحدہ قومیت کے حوالے سے کر رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں، لیکن جو بات آپ ''قائد اعظم'' کے منہ میں ڈال رہے ہیں وہ ان کے اوپر چست آتی ہے اور نہ آپ کے لیے اسے کہنا موزوں ہے۔ جناح صاحب ہرگز 'کونوا عباد اللہ' (اللہ

کے بندے بن جاؤ) کی دعوت نہیں دے رہے۔ وہ دعوت دے رہے ہیں کہ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔ دونوں میں، اگر آپ پڑھے لکھے ہیں تو کتنا فرق ہے، ضرور جانتے ہوں گے... اور لوگوں نے بھی اس فرق کو سمجھا۔

مگر اس سے "ترجمان القرآن" اور "الاصلاح" میں ایک بحث چھڑ گئی۔ بحث میں بات اور نکھر کر سامنے آئی کہ مودودی صاحب کم زور مقام پر کھڑے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میری تنقید سے سید سلیمان ندوی اور مولانا منظور نعمانی نے بھی اتفاق کیا... میں نے لکھا کہ متحدہ قومیت کے بارے میں آپ یہ بھی لکھ دیں کہ یہ کفر ہے تو مجھے اعتراض نہیں، لیکن جب آپ یہ کہتے ہیں کہ جناح صاحب بھی یہی کہتے ہیں تو سراسر غلط کہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلا کر انھیں اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلانا نہیں، اس کی طرف ان کا کوئی اشارہ بھی نہیں، مراد بھی نہیں، بلکہ وہ صرف عصبیت کی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دے رہے ہیں، جو غلط بھی ہو سکتی ہے اور درست بھی، لیکن وہ کوئی دینی دعوت نہیں۔ اب یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی وہ زیادہ دیر تک مخالفت کرتے۔ میری حمایت میں جو لوگ تھے، وہ مولانا مودودی کے بھی احباب میں شامل تھے۔ انھوں نے مولانا مودودی کو سمجھایا۔ اس پر انھوں نے اپنی رائے بدلی۔ مجھے بہت ہی مہذب لہجے میں ایک خط لکھا۔ انھوں نے واضح کیا کہ وہ وہی کچھ سمجھتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے وہ مضامین لکھے جو بعد میں ان کی کتاب "سیاسی کشمکش" کے تیسرے حصے میں شامل ہیں۔ اس میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے وہی کچھ لکھا اور لب و لہجہ بدل کر لکھا جو میں انھیں سمجھانا چاہتا تھا۔"

مولانا منظور نعمانی کا کردار

اسی بیانیے کو آگے بڑھاتے ہوئے مولانا اصلاحی مزید فرماتے ہیں:

"اس کے بعد جب جماعت اسلامی قائم ہونے لگی تو مولانا منظور نعمانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ دیکھو، اب تو تمھاری اور مودودی صاحب کی صلح ہو گئی ہے۔ اب اگر کوئی اسی لائن پر جو تم نے کہی ہے، کوئی جماعت بنی تو کیا تم اس میں شریک ہو گے؟ میں نے کہا کہ مولانا! میں

اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں کہ جماعتوں میں شریک ہوتا پھروں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے پیدا کیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ میں وہی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں مولانا (حمید الدین فراہی) کی کتابوں کو مکمل کرنا اور ان کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔ شاید یہاں (مدرسۃ الاصلاح) میں مجھے اس کا موقع مل جائے۔ ہاں البتہ جن خطوط کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان پر اگر کوئی جماعت بنی تو میری دعائیں اور ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں گی۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ شمولیت کا وعدہ نہیں کر سکتا۔"

مولانا مزید بتاتے ہیں:

"میرے اس موقف کے باوجود مولانا منظور نعمانی مُصر ہو گئے۔ مجھے منانے لگے کہ چلو تم وہی کرو جو کہتے ہو لیکن تمھاری مولانا مودودی سے ایک ملاقات ضرور ہونی چاہیے... سمجھ گئے آپ... یہ کہا انھوں نے مجھے!"

مولانا مودودی سے لاہور میں ملاقات

اس کے بعد مولانا بتاتے ہیں کہ مولانا منظور نعمانی مجھے گھسیٹ کے لاہور لے گئے۔ یعنی مولانا اس ملاقات کے لیے بادل نخواستہ گئے۔ وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ یہ ایک باقاعدہ اجتماع ہے اور خاصے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ یہ اجتماع دو تین دن جاری رہا۔ یہ اگست 1941ء میں ہونے والے جماعت کے تاسیسی جلسے سے پہلے منعقد ہوا تھا۔ اجتماع کی اہم تفصیل مولانا اصلاحی کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے:

"اس میں مولانا مودودی نے اپنی تفسیر کی پہلی قسط سنائی۔ وہ اس تفسیر کا آغاز کر چکے تھے۔ لوگوں نے معلوم نہیں کیا رائے دی۔ مجھ سے میری رائے لی تو میں نے کہا کہ مولانا آپ یہ کام نہ کریں۔ آپ اشخاص تیار کریں... سن لیا آپ نے؟ میں نے واضح طور پر کہا کہ آپ یہ کام نہ کریں۔ اشخاص تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ تفسیر لکھنے کا کام میں کر لوں گا۔ یہ بات ان کو کھٹکی۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ آپ تفسیر نہ لکھیں۔ اس کے بعد کسی وقت مجھے وہاں تقریر کرنے کو کہا گیا۔ میں نے برملا کہا کہ جس کام کا آپ منصوبہ بنا رہے ہیں، یہ بہت مبارک کام ہے۔ لیکن اس کی تیاری کے بہت مراحل ہیں اور یہ بہت تیاری مانگتا ہے۔"

مولانا کے کہنے کا مطلب تھا کہ آپ لوگوں کو دین کے مطالبات پورے کرنے کے لیے جو جماعت بنانے کا منصوبہ رکھتے ہیں، وہ بہت نیک کام ہے، لیکن ان کی نظر میں اس کے لیے جس تیاری کی ضرورت تھی، وہ ابھی مفقود تھی۔ یہ مولانا اصلاحی کی مولانا مودودی کے ساتھ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔

اجتماع سے واپس آئے تو مولانا نعمانی نے ان سے رائے پوچھی کہ آپ نے مولانا مودودی کو کیسا پایا؟ اس موقع پر مولانا نے اپنی رائے دینے سے بہت گریز کیا۔ انھی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”انھوں نے پوچھا تو میں نے اِدھر منہ کر لیا۔ انھوں نے اِدھر سے پوچھا تو میں نے اُدھر منہ کر لیا۔ وہ بہت مُصر ہوئے تو میں نے کہہ دیا۔ میں نے جو فقرہ کہا، وہ انھوں نے اس وقت افشا کیا جب میں نے مولویوں کے مقابلے میں مولانا مودودی کا دفاع کیا تھا۔ اور مولانا نعمانی نے اپنے رسالے میں مجھ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ وہ مولانا مودودی کو یہ کہتا تھا۔ اور اب سن لیں کہ میں نے مولانا مودودی کو اگر (غلام احمد) پرویز جیسا کہا تھا تو اس وقت کے پرویز جیسا کہا تھا نہ کہ بعد کے زمانے کے پرویز جیسا۔ اس زمانے میں ان کے مضامین اچھے ہوتے تھے اور بہت اصلاحی ہوتے تھے۔ ”معارف“ (جس کے ایڈیٹر مولانا منظور نعمانی تھے) میں چھپتے تھے۔ میرے رسالے (الاصلاح) میں چھپتے تھے۔ اور رسالوں میں چھپتے تھے۔ میرا مطلب تھا کہ بس یونہی (دانش وارانہ) لکھتے تھے نہ کہ (عالمانہ) بس اچھا لکھتے تھے۔“

”خیر اس کے بعد مولانا نعمانی بریلی چلے گئے اور میں اعظم گڑھ۔ چند دنوں کے بعد جماعت اسلامی قائم کرنے کے لیے باقاعدہ اجتماع منعقد ہونے کا اعلان ہوا۔ مجھے بلایا گیا۔ میں نہیں گیا... سن لیا آپ نے... میں نہیں گیا۔ مگر اجتماع ہوا۔ جماعت قائم ہو گئی۔ اعلان ہوا کہ فلاں فلاں اس میں شریک تھے۔ اس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ اب یہ اخبار میں چھپا تو سید (سلیمان ندوی) صاحب نے بھی پڑھا۔ اب وہ تو مجھے اپنی جنگ کا سپہ سالار سمجھتے تھے۔ انھوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا تو کہنے لگے کہ تم تو اجتماع میں گئے نہیں، پھر تمھارا نام کیسے آ گیا؟ میں نے کہا کہ دیکھ لیں، بس آ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ اس کی تردید کر دیں۔ میں نے کہا جانے دیں، مناسب نہیں لگتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نہیں کرتے تو میں کر دیتا ہوں۔ میں نے کہا: کیوں کرتے ہیں تردید، نیکی کا کام ہی کریں گے نا، جانے دیں۔“

''اور میں سچ کہتا ہوں کہ صرف اس خیال سے تردید نہ کی کہ مولانا مودودی اور مولانا نعمانی نے یہ اعتماد کر کے میرا نام لکھا ہو گا کہ یہ انکار نہیں کرے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا نعمانی نے ان کو اطمینان دلایا ہو گا کہ وہ تردید نہیں کرے گا۔ دراصل میرے اور مولانا نعمانی کے درمیان ایسے ہی برادرانہ تعلقات تھے۔ سمجھ گئے آپ! اس طرح میرا نام بانیان میں آگیا اور میں جماعت اسلامی کا رکن رکین بن گیا دراں حالیکہ نہ میں نے کسی سے درخواست کی نہ کوئی فارم بھرا نہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کی نہ کسی سے کوئی عہد کیا لیکن یہ سارے مناصب عالیہ مجھ کو حاصل ہو گئے۔''

پچاس ہزار کا معاملہ

جب مولانا اصلاحی جماعت اسلامی کے رکن قرار پا گئے، اس وقت تک ''الاصلاح'' بند ہو چکا تھا اور ایک وقفے کے بعد ''اصلاح'' جاری ہو چکا تھا۔ اور ''الاصلاح'' کی بندش وسائل کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ مدرسے کے معاملات میں اختلافات کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ اختلاف براہ راست مولانا اصلاحی سے تھے۔ مولانا نے اس کی تفصیل نہیں بتائی صرف اشاروں کنایوں میں یہ بات کی:

''میں نے ہمیشہ ذاتی حیثیت ہی سے کام کیا۔ ان لوگوں نے سازش کی، پرچہ بند کرا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کام نہیں ہو گا، لیکن میرے لیے ذاتی وسائل سے پرچہ جاری کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

لگتا ہے کہ مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے ''اصلاح'' ذاتی حیثیت سے جاری کر دیا، لیکن وہ جنگ کے باعث کاغذ کی کم یابی کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں مولانا بتاتے ہیں:

''اس کے بعد ڈاکٹر حبیب اللہ مرحوم نے مجھے خط لکھا کہ میں اعظم گڑھ کے بینک میں تمھارے نام سے پچاس ہزار روپے جمع کرا رہا ہوں۔ بینک سے جو کاغذات آئیں گے اس پر دستخط کر دیجیے گا۔ میں نے انھیں جواب لکھا کہ میں اتنی بھاری ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ آپ بہت زیادہ بوجھ میرے اوپر ڈال رہے ہیں۔ اس کے بجائے آپ ایک ٹرسٹ بنا دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ میں ٹرسٹ نہیں بناؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمھیں ذرہ بھر بھی تنگ کرے، لیکن یہ تمھیں بہت تنگ کریں

گے۔ اس لیے ٹرسٹ کی ضرورت نہیں ہے تم ان پیسوں سے جو بھی دین کا کام کرنا چاہتے ہو، کر سکتے ہو۔ یوں انھوں نے یہ رقم میرے نام کرا دی۔ اور اب صورت حال یہ تھی کہ میں جماعت اسلامی کا رکن تھا، رسالہ وغیرہ بند ہو چکا تھا۔ مدرسے میں میرے لیے حالات ناخوش گوار تھے، اگرچہ اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں میرے ذاتی حیثیت میں کسی سے کوئی اختلاف نہیں تھے۔ ان حالات میں مجھے مولانا مودودی کا پیغام آیا کہ آپ میرے پاس آجائیں۔‘‘

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

دھواں

یہ آبجو کے کناروں پہ یاسمین کا ہجوم
روش روش پہ نخیلِ بلند گوناگوں
یہ شاخ شاخ صبوحی، یہ باغباں کا لہو
چمن چمن رگِ لالہ میں بند ہے جیحوں

اِدھر ببول کے سایے میں ایک مردِ فقیر
اٹھا رہا ہے نگاہوں کی جستجو کا حجاب
اُدھر چنار کی چھاؤں میں سرخ رو بچے
ورائے چرخ سے بوڑھے کی آرزو کا جواب

افق کے پاس فضاؤں میں چمنیوں کا دھواں
ہوا کے دوش پہ مردِ ضعیف نے دیکھا

اٹھا ببول کے سایے سے زرد رو، خاموش
وفورِ یاس میں بچوں کو دیکھ کر بولا

یہ چمنیاں کبھی دیکھو تو جا کے سو جاؤ
اِسی چنار کی چھاؤں میں دفن ہو جاؤ

گفتگو: محمد حسن الیاس

سوالات: نجم سہر وردی

تدوین و ترتیب: رانا معظم صفدر

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

جناب محمد حسن الیاس سے ایک انٹرویو

(2)

[''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ'' کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن اور ''اشراق امریکہ'' (آڈیو) کے مدیر محمد حسن الیاس صاحب گذشتہ دنوں پاکستان گئے تو ''آف دا اسکول'' پوڈ کاسٹ کے میزبان نجم سہر وردی نے اُن کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو میں اُن سے پاکستان اور مسلمانوں کو درپیش مختلف مسائل پر سوالات کیے گئے۔ حسن الیاس صاحب نے اُن کے جواب میں پوری وضاحت سے اپنے موقف کو پیش کیا۔ یہ انٹرویو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اِسے ضروری ترتیب و تدوین اور حک و اضافے کے بعد ''اشراق امریکہ'' کے قارئین کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

پاکستان اور امریکہ کے معاشی نظام کا فرق

سوال: ہمارے مشاہدے میں یہ چیز آتی ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ معاشروں میں لوگ ٹیکسی چلانے یا الیکٹریشن اور پلمبرنگ جیسے ہنر مندی کے پیشوں کو معیوب خیال نہیں کرتے، بلکہ وہاں وہ اس طرح کے پیشوں سے اتنا کماتے ہیں کہ بہ آسانی پوش علاقوں میں گھر خرید لیتے ہیں۔ اس کے برعکس، ہمارے معاشرے میں ایسے پیشوں کو کم تر سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر کوئی دل میں بڑی ڈگری لینے کی خواہش لیے پھرتا ہے، جب کہ اعلیٰ ڈگری لے کر حتیٰ کہ ڈاکٹر انجینئر بننے کے باوجود آمدن کی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ کراچی جیسے شہر میں اپنا گھر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: دیکھیے، اس میں دو پہلو ہیں: ایک پہلو ہمارے ہاں یہ المیہ ہے کہ پیشے کو عزت یا نفرت کے تعارف سے بچپن سے ہی ذہنوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ والدین اپنے روزمرہ جملوں میں بچوں کو اس طرح کی باتیں کہتے ہیں کہ اگر نہیں پڑھو گے تو زندگی میں کیا کرو گے، کیا ریڑھی لگاؤ گے؟ آپ دیکھیں، کس طرح حقارت اور کم تری سے ایک پیشہ کا تعارف ذہن میں بٹھایا جا رہا ہے۔ یعنی ایک طرف تعلیم کو شعور کے حصول کے بجاے محض روزگار کا ذریعہ بتایا جا رہا ہے اور دوسری طرف ریڑھی لگانے کو ایک حقیر روزگار کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس، اسی پیشے کو، یعنی ریڑھی لگانے کو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں سٹارٹ اپ کا نام دیا جاتا ہے اور اِسے 'entrepreneurship' کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ریڑھی کے کاروبار اور ریڑھی لگانے والے کے بارے میں وہاں حقارت اور کم تری کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چنانچہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے ہمیں اپنے معاشرے میں یہ عام کرنے کی ضرورت ہے کہ محنت کر کے جائز طریقے سے کمائی کے تمام پیشے باعزت ہیں۔

دوسرا پہلو اس میں مسابقت اور مقابلہ بازی (comparison) کے مسئلہ کا ہے۔ ہمارے ہاں اپنی صلاحیتوں، ترجیحات اور میسر مواقع کو بنیاد بنا کر پیشے کا انتخاب نہیں کیا جاتا، بلکہ دوسروں کے ساتھ خواہ مخواہ کی دوڑ کا رویہ ہے۔ یہ رویہ اپنی اصل میں مخاصمت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی نفسیات پر مبنی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں لوگ اس نفسیات میں نہیں پڑتے، ہمارے ہاں اس چیز

کی بھی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

سوال: امریکہ یا ایسے ترقی یافتہ معاشروں نے ایسا کیا طریقہ اختیار کیا جو ہم بھی اختیار کر کے بہتری لا سکیں اور ترقی کر سکیں؟ کیا آپ ان معاشروں کا مطالعہ (study) کرنے کا مشورہ دیتے ہیں؟

جواب: دیکھیے، کسی سوسائٹی کا ایک مطالعہ خارج میں بیٹھ کر کیا جاتا ہے، جیسے کتابوں کے ذریعے سے، فلموں کے ذریعے سے، سفر ناموں کے ذریعے سے اور ایک مطالعہ وہاں جا کر براہ راست خود مشاہدہ کرنا ہے۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ تاہم، بہتری کے لیے اس طرح کی کوشش سے یقیناً فائدہ ہو گا، لیکن میرے نزدیک اس مطالعہ کے نتیجے میں بھی اصلاحِ احوال اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے اندر اتنی برداشت پیدا کر لیں کہ جو تبدیلیاں دنیا میں ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں، ہم ان پر کھل کر بات کر سکیں اور ناگزیر تبدیلیوں کے لیے اپنی قوم کو آمادہ کر سکیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے عدم برداشت اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ہم اختلافی نظریات رکھنے والے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں غامدی صاحب اور میری مثال آپ کے سامنے ہے کہ کس طرح ہم اپنے نظریات کی وجہ سے 'persecution' کا شکار رہے۔ ہمیں آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا، حتیٰ کی مجبوراً ہم ملائیشیا چلے گئے۔

بر سبیل تنزل، میں یہاں ملائیشیا کی مثال دینا چاہوں گا۔ ملائیشیا ایک اسلامی ملک ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں دین ایک تہذیب اور روایت ہے۔ دین جو بنیادی اقدار پیدا کرتا ہے، وہ ان کے معاشرتی اقدار کے نظام (Social Value System) میں نظر آتی ہیں۔ وہاں کے لوگوں میں اچھی اخلاقیات ہیں، وہاں پر ہنر مندی کا جذبہ ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ملائیشیا پہلے دن سے ایسا ملک نہیں تھا، اس ماڈرن ملائیشیا کے بانی مہاتیر محمد ہیں۔ ایک دفعہ میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے اِس ترقی کا راز پوچھا۔ میں یہ راز اِس لیے بھی جاننا چاہتا تھا کہ ہم پاکستانی بھی اسلام کا بہت دم بھرتے ہیں اور ہمارے اندر ترقی کرنے کی خواہش بھی ہے۔ چنانچہ میں جاننا چاہتا تھا کہ راز کیا ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ میں نے اپنی قوم کی تعمیر و ترقی کا فارمولا یہ بنایا کہ ہمارے اندر جو دس سے بارہ فی صد صاحبِ بصیرت (intellectuals) ہیں، ان میں یہ ہنر پیدا کر دیا جائے کہ وہ باقی نوے فی صد کو کام پر لگائیں۔ چنانچہ دس سے بارہ فی صد لوگ باقی نوے فی

صد کو کام کرنا سکھاتے ہیں۔ اس طریقے سے قوم ایک سمت (direction) پر چل پڑی۔

اب، اگر ہم اپنے ملک کو دیکھیں تو ایک سمت میں چلنے میں کئی طرح کے چیلنج درپیش ہیں۔ جیسے، ہمارے ہاں ریاست کے اندر ریاستیں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ریاست 'نامعلوم لوگوں' کی ہے، ایک ریاست 'مذہبی لوگوں' کی ہے، ان کی وجہ سے معاشرے کے لوگ ایک سمت میں چلنے کے بجاے آپس کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایک اور بڑا چیلنج عدم استحکام ہے۔ صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ گھر سے لے کر معاشرے تک اور دکان سے لے کر ریاستی اداروں تک، کہیں بھی استحکام نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں استحکام کے بجاے تصادم (confrontation) ہو گا، وہاں انسان کبھی بھی اجتماعی طور پر نہیں سوچتا۔ وہ صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے۔ میں آپ کو روز مرہ مشاہدے کی مثال دیتا ہوں۔ کراچی کی سڑکوں پر ہر گاڑی والا، ہر موٹر سائیکل سوار اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کہیں ٹریفک نہ پھنس جائے اس کوشش میں ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ نکل جائے، خواہ دوسرے بعد میں گھنٹوں خوار ہوتے رہیں۔ یہ رویہ اور یہ نفسیات اب ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے۔ ہم ہر معاملے میں، اپنی قوم اپنے لوگوں کی پروا کیے بغیر صرف اپنی ذات کا سوچتے ہوئے دوسرے سے آگے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ہماری اصلاح کے لیے یہ تبدیلی بہت ضروری ہے کہ جس طرح ملائیشیا کی قوم نے خود کو بہ حیثیت قوم پہچانا اور وہ ایک سمت میں چل پڑے، ہم بھی اپنی ذات سے اوپر اٹھیں اور ایک قوم کی طرح سوچیں۔

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو قوم کی ترقی اور خوش حالی کے اس معاملے میں امریکہ بہت سا سفر طے کر کے ایک مقام تک پہنچ چکا ہے۔ یہاں، اب صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کو بروے کار لا کر آگے بڑھ رہا ہے اور ریاست کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم کرے۔ آپ دیکھیے، وہ اپنے شہریوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی پناہ اور تحفظ دیتے ہیں جن کے لیے اپنے مذہبی یا سیاسی نظریات کی وجہ سے اپنے ملکوں میں رہنا ممکن نہ رہے۔ ہم جیسے مذہبی لوگوں کے لیے جب اپنے ملک میں رہنا ممکن نہ رہے تو امریکہ ہی میں جگہ ملتی ہے۔ اس پر لوگوں کو یہ غور کرنا چاہیے کہ ملک میں عدم برداشت اور عدم تحفظ کی یہ صورت کیوں کر ہو گئی ہے، جب کہ لوگ اعتراض یہ کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم لوگ یہود و ہنود کی گود میں

جا بیٹھے ہیں۔

سوال: امریکہ کے معاشی نظام کی اگر بات کریں تو سرمایہ دارانہ نظام کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس پر مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تنقید ہوتی ہے اور سماجی اور معاشی لحاظ سے بھی اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ آپ چونکہ اب وہاں مقیم ہیں اور چیزیں براہ راست آپ کے مشاہدے میں ہیں تو امریکی سرمایہ دارانہ نظام کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: میرے ہاں کسی بھی بات کو سمجھنے کا عمل فطرت کے ان عوامل کے مطالعے سے شروع ہوتا ہے جو اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھے ہیں۔ جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام پر لوگوں کی تنقیدات ہیں، سچی بات ہے کہ وہ مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ مجھے یاد ہے، ایک زمانے میں ہم کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں جاتے تھے۔ اور وہاں پر ایک بڑی اچھی بزم اور انجمن لگتی تھی۔ وہاں داخل ہو کر لگتا تھا کہ کسی دوسری دنیا میں آ گئے ہیں، کیونکہ وہاں پر نئے نئے نظام اور افکار کی باتیں ہوتی تھیں۔ وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی اور اس کی ریشہ دوانیوں پر بات کرنے والے فلاسفر بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک بار مجھے ایک صاحب نے کہا یہ نظام لوگوں کے اندر حرص اور لالچ کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔ انھیں نت نئی چیزیں دکھا کر اس کی خریداری پر راغب کرتا ہے، اور پھر لوگ ان چیزوں کو خرید کر فخر کی نفسیات میں آ جاتے ہیں۔ یہ نظام اس فخر کی نفسیات کا فائدہ اٹھا کر انسان کی جیب میں سے آخری چونی تک کو اینٹھ لینے کی ایک پوری کی پوری منظم کاوش ہے... ان کی بات ابھی جاری تھی کہ ہم نے کھڑکی سے دیکھا کہ ایک شخص نئی گاڑی بڑے زور سے دوڑاتے ہوئے لے کر گیا۔ اِس پر اُنھوں نے کہا کہ یہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کے مفاسد۔ اِس کو پہلے گاڑی کے اشتہار دکھا کر اس کے اندر حرص پیدا کی گئی، اب اِس نے گاڑی خریدی ہے اور یہ فخر سے اِس گاڑی کو کراچی یونیورسٹی کی سڑکوں پہ دوڑا رہا ہے۔ اِس پر میں نے پلٹ کر اُن سے کہا کہ یہ فخر تو گھوڑا خرید کر بھی محسوس ہوتا ہے۔ یعنی اگر میرے پاس نیا گھوڑا ہو اور میں اُس پر سوار ہو کر سڑک پر نکلوں تو میرے اندر یہ نفسیات پیدا ہو گی، کیونکہ برتری اور تفوق کا جذبہ اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ میرے اندر یہ جبلت نہیں ہونی چاہیے؟ نئی چیز لے کر خوشی نہیں ہونی چاہیے؟ اِسی طرح اللہ نے اگر مجھے کوئی صلاحیت دی ہے تو میں اس کے ذریعے سے لوگوں کو اُس پہ متوجہ نہ کروں؟ یہ تو میں روز کر رہا ہوتا ہوں، اور میں یہ

سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری جبلت ہے۔ اگر اس جبلت کو کسی معیشت نے اپنا لیا ہے تو بہ حیثیتِ نظام کیسے اس کو انسانی فطرت سے مزاحم قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اپروچ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔

دوسری طرف جو لوگ نجی ملکیت کی مخالفت میں مشترکہ ملکیت کے نظام کی حمایت کرتے ہیں، وہاں پر بھی میں فلسفیوں کے تصورات میں جانے سے پہلے اپنی فطرت کو دیکھتا ہوں۔ بھئی! میری فطرت میں ملکیت کا تصور ہے۔ میں 'ownership' کے ساتھ 'attachment' محسوس کرتا ہوں۔ جیسے ہمارے اندر مٹی کی 'ownership' ہے۔ مثلاً میں جب بھی امریکہ سے کراچی آتا ہوں تو میرے اندر ایک جذبۂ سپاس محسوس ہوتا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو میرا جواب یہی ہوگا کہ میں چونکہ یہاں سے مستفید ہو کر نکلا ہوں، اس مٹی سے تعلق رکھتا ہوں، اس لیے میرے یہ جذبات ہیں۔ کیا 'ownership' کے جذبات غلط اور غیر فطری ہیں کہ جنھیں ختم کر دینا چاہیے؟

سرمایہ دارانہ نظام یا دنیا میں بنایا گیا کوئی بھی نظام جو انسان نے بنایا ہے، ان کے اندر مفاسد ہو سکتے ہیں، دیکھنا یہ چاہیے کہ فوائد کیا ہیں اور کیا بہتری کے امکانات موجود ہیں۔ اور اس سے پہلے اس نظام کو اپنی فطرت سے ہم آہنگی کے تصورات کے ساتھ دیکھیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی نفی کرتے ہوئے بعض لوگ اِس کے متبادل میں اسلامی نظام معیشت کا نام لیتے ہیں۔ یہ اصل میں بارہ چودہ سو سال پہلے کی عرب معاشرت کے اندر پیدا ہونے والی ایک مخصوص دور کی فقہ ہے، اگرچہ لوگ اس کو اسلام کا نام دے دیتے ہیں اور اس سے ایک نظام پیش کرتے ہیں۔ جب اس نظام پر بات کی جائے گی تو اس پر بھی کئی اعتراضات سامنے آجائیں گے۔

امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کے تناظر میں، میں آپ کو بتاتا چلوں کہ وہاں پر ریاست اپنے شہریوں کو ایک خاص معیارِ زندگی تک لے جانا چاہتی ہے۔ جس میں ہر شہری کو تعلیم اور بنیادی صحت کی سہولت میسر ہو۔ اس کے بعد وہ شہریوں کے ہنر کو آزماتے ہیں۔ آپ سمجھیں جیسے اللہ تعالیٰ آپ کو آزمانے کے لیے ارادہ و اختیار کے شعور کے ساتھ دنیا میں بھیجتے ہیں۔ ایسے ہی سرمایہ دارانہ نظام بھی آپ کو آزماتا ہے۔ اور اس آزمایش میں جو لوگ کم زور ہوتے ہیں، وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یوں پیچھے رہنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ نظام ہمیں پیچھے چھوڑ کے چلا گیا ہے۔

سوال: تو کیا اس کو 'Survival of the fittest' کہنا بجا ہوگا؟

جواب: بالکل! ایسا ہی ہے۔ دنیا کا اصول اسی پر ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ آپ کے اس اسکول میں بھی 'Survival of the fittest' ہی کا قانون ہے۔ ایک ٹیچر آتا ہے اور اپنی پرفارمنس دیتا ہے، اگر وہ پرفارمنس آپ کے لیے قابل قبول ہوتی ہے تو وہ آگے 'survive' کرتا ہے، بہ صورتِ دیگر آپ اس کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ دنیا کا نظام اِسی کے مطابق چل رہا ہے۔ تو سرمایہ دارانہ نظام کے مفاسد لوگ بیان کرتے ہیں، لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ فری مارکیٹ اکانومی میں جب آپ انسانوں کو ان کے اپنے داخلی شعور پہ چھوڑ دیتے ہیں تو بہت ساری چیزیں بہتر ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چیزوں کی تنقیح ہوتی ہے۔ اس معاملے میں بھی خود امریکہ میں اس میں تنقیح ہوئی۔ اب آپ دیکھیے کہ کارل مارکس کے نظریات پر مبنی نظام سے جو مفاسد سامنے آئے ــــ جو ظلم و استبداد پیدا ہوا ــــ اس پر آواز اٹھائی گئی، جس پر اُس کی تنقیح کی گئی، پھر یہیں سے بہتری پیدا ہوئی۔ اِس وقت جتنے قوانین (laws) نظر آتے ہیں جیسے 'labour laws' یا 'human rights' وہ اِسی تنقیح کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ کسی نظام کے فوائد کو نظر انداز کر کے اس کے مفاسد کی وجہ سے رد کر دینا کوئی دانش مندی نہیں، بلکہ اس میں بہتری کے امکانات کو دیکھا جائے اور مفاسد کو دور کیا جائے۔

[باقی]

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[جولائی 2024ء]

”صالحات“ کا اجرا

جاوید احمد غامدی صاحب کی زیر سرپرستی خاص خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے ”صالحات“ کے نام سے سہ ماہی رسالے کا اجرا کیا گیا۔ محمد حسن الیاس صاحب اس کے نگران ہیں، جب کہ اس کی ادارت کے فرائض جناب نعیم احمد بلوچ سرانجام دے رہے ہیں اور نائب مدیر یاسمین فرخ صاحبہ ہیں۔ خواتین کی جانب سے غامدی سینٹر کی اس کاوش کو بہت سراہا گیا ہے۔ قارئین اس رسالے کو غامدی سینٹر کی ویب سائٹ پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

غامدی سینٹر کا مقصد

گذشتہ ماہ ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ“ کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ ایکیڈیمکس جناب حسن الیاس نے وائس آف امریکہ کے نمایندے ثاقب الاسلام کو انٹرویو دیا، جس میں انھوں نے امریکہ میں غامدی سینٹر کے قیام کا مقصد بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ غامدی سینٹر کے قیام کا مقصد مسلمان نوجوانوں کے اندر وہ صلاحیت پیدا کرنا ہے، جس کے ذریعے سے وہ مذہب کا شعوری مطالعہ کر سکیں۔ مزید برآں انھوں نے غامدی سینٹر کو تمام مکتبۂ فکر اور تمام مذاہب کے لوگوں

کے لیے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہم دنیا کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کو علم کے طریقے پر سمجھیں اور تمام علما کو اپنی امت کا سرمایہ سمجھتے ہوئے ان کی بات کو استدلال کی بنیاد پر مانیں، نہ کہ تقلید کی بنیاد پر۔ اس انٹرویو کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

آن لائن خانقاہ کا آغاز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام آن لائن خانقاہ کا آغاز کیا گیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر اصلاحِ نفس سے متعلق پروگرام ہے، جس میں معز امجد صاحب لوگوں کے نفس کی اصلاح اور تربیت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں اور اس سے متعلق لوگوں کی طرف سے پوچھے گئے سوالوں کا جواب بھی دیتے ہیں۔ ہر ہفتے اس کی ایک نشست غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر کی جاتی ہے۔

''تفہیم الآثار'' پروجیکٹ

غامدی سنٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ کے زیر اہتمام ''تفہیم الآثار'' کے عنوان سے ایک پروگرام کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس میں صحابہ و تابعین کے آثار کی شرح و وضاحت اور منتخب آثار پر مبنی سوال و جواب کی نشستیں ریکارڈ کی جا رہی ہیں۔ اس پروگرام کی میزبانی کے فرائض ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن سرانجام دے رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر عمار خان ناصر اس میں بہ طورِ مہمان شریک ہیں۔ جون 2024ء میں اس کے 2 پروگرام ریکارڈ ہوئے، جن میں دینی علم و عمل میں صحابہ کی امتیازی حیثیت کی بنیاد کیا ہے؟، دینی روایت میں صحابہ و تابعین کے فہم و عمل کو کیا اہمیت دی گئی ہے؟، تفہیم الآثار کے منصوبے کی کیا نوعیت ہے اور اس کے دینی و علمی اہداف کیا ہیں؟ اور کن صحابۂ کرام کے آثار کو اس مجموعے میں شامل کیا جائے گا؟ جیسے اہم سوالوں کو زیر بحث لایا گیا۔ ان پروگراموں کو ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''سیاسی، سماجی اور مذہبی قائدین کا رویہ''

مدیر ''اشراق، امریکہ'' منظور الحسن صاحب اپنے اس مضمون میں اس سوال کو زیر بحث

لائے ہیں کہ سیاسی، سماجی اور مذہبی قائدین کو اپنے رفقا و معاونین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ قرآن مجید کی آیات اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قیادت کے لیے ناگزیر وصف یہ ہے کہ قائدین اپنے رفقا و معاونین کے ساتھ نرمی اور محبت سے بات کریں، اُن کے مشورے کو توجہ سے سنیں، اُن کی غلطیوں سے صرف نظر کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی عزتِ نفس کا خیال رکھیں۔ لوگوں کو یہ رویہ اگر نہ ملے تو وہ رنجیدہ اور بد دل ہو کر کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور بعض صورتوں میں مخالفت اور معاندت کی حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مضمون ''اشراق، امریکہ'' کے جون 2024ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

غامدی صاحب کی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشستیں

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہر ہفتے سوال و جواب کی لائیو نشست منعقد کی جاتی ہے، جس میں حسن الیاس صاحب غامدی سینٹر کو موصول ہونے والے مختلف نوعیت کے سوال غامدی صاحب کے سامنے رکھتے ہیں اور غامدی صاحب ان کا جواب دیتے ہیں۔ گذشتہ ماہ ان نشستوں میں پوچھے گئے اہم سوالات یہ ہیں: ''اہل تصوف اور نبی کی اصطلاح'' اور ''کیا انسانی دودھ کا بینک جائز ہے؟'' سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

''حدیث کیا ہے؟'' پر اعتراضات کا جائزہ

پچھلے کئی ماہ سے غامدی سینٹر کے زیر اہتمام 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ''حدیث کیا ہے؟'' کا موضوع زیر بحث ہے۔ اس موضوع کے تمام بنیادی مباحث کو زیر بحث لانے کے بعد اب ان اعتراضات اور سوالات کو موضوعِ بحث بنایا جا رہا ہے، جو اب تک کی نشستوں میں بیان ہونے والی گفتگو پر ناظرین کی طرف سے کیے گئے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سیریز کی 3 نشستیں منعقد ہوئیں۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''عمار خان ناصر کو بات نہیں کرنے دیں گے''

یہ مضمون حال ہی میں پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ میں ہونے والی ایک احمدی ملزم کے مقدمے

کی کارروائی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس مقدمے کی کارروائی کے دوران میں مذہبی علما نے چیف جسٹس کے ساتھ کافی بحث و تکرار کے بعد ڈاکٹر عمار خان ناصر کو اس مقدمے میں اپنی انفرادی رائے پیش کرنے سے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ اس سے فیصلہ متنازع ہو جائے گا۔ اس مضمون میں مذہبی علما کے اسی طرز عمل پر نقد کرتے ہوئے حسن صاحب نے لکھا ہے کہ مذہبی علما اپنی ہر بات منوانے کے لیے تحکم کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور لوگوں کے فکر و عمل پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ہر رائے کو حتمی، ہر قول کو فیصل اور ہر فیصلے کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والوں کو باغی، گم راہ اور منحرف قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون ”اشراق، امریکہ“ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں پر ڈاکومینٹری

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام دورِ حاضر کے جید عالم دین مولانا وحید الدین خاں کی زندگی پر ایک ڈاکومینٹری بنانے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس ڈاکومینٹری میں مولانا وحید الدین خان کے علمی، فکری، تحقیقی اور دعوتی سفر کے علاوہ ان کے خاندانی پس منظر سے لے کر ان کی دعوت کی آخری سعی تک کے تمام مراحل کو پیش کیا جائے گا۔ جلد ہی اس کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا جائے گا۔

”صبر: دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ“

ریحان احمد یوسفی صاحب نے اپنے اس مضمون میں صبر کی اہمیت و فضیلت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف معانی و مفاہیم کو بھی کھولا ہے۔ صبر سے متعلق لوگوں میں پائی جانے والی بعض غلط فہمیوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صبر کو ہمارے ہاں عام طور پر ایک سلبی چیز سمجھا جاتا ہے، جو مجبوری اور بے بسی کے عالم میں کیا جاتا ہے۔ اس کا دائرہ غم و مشکلات تک محدود کر دیا گیا ہے اور اسے بزدلی اور کم ہمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے صبر ہمارے مذہبی فکر میں اپنی اصل جگہ نہیں پا سکا۔ مزید برآں انھوں نے صبر کو دنیا میں بھی فوز و فلاح کی شاہِ کلید اور دشمنوں کی چالوں اور سازشوں سے بچنے کا

نسخہ بتایا ہے۔ یہ مضمون جون 2024ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

غامدی سینٹر کے آن لائن تعلیمی کورسز

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے غامدی سینٹر کے آن لائن لرننگ پلیٹ فارم کے لیے انگریزی زبان میں 3 تعلیمی کورسز مرتب کیے، جن کے عنوانات یہ ہیں: ''Divorce Laws''، ''Dietary Shariah and Islamic Customs'' اور ''Jihad in Islam''۔ ان میں سے ایک کورس ''CustomsDietary Shariah and Islamic'' کو غامدی سینٹر کی ویب سائٹ پر شائع کر دیا گیا ہے، جب کہ باقی دو بھی جلد ہی شائع کر دیے جائیں گے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 3 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے ''میزان'' کے جن موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچر ریکارڈ کرائے، وہ یہ ہیں: ''فلسفۂ حج''، ''چوری کی سزا''، ''قذف کی سزا''، ''انسانیت'' اور ''خوش گوار ازدواجی زندگی کے بنیادی عوامل''۔ ان لیکچرز کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

جون 2024ء میں دنیا نیوز چینل پر نشر ہونے والے پروگرام ''علم و حکمت: غامدی کے

ساتھ" میں جن موضوعات پر گفتگو کی گئی، وہ یہ ہیں: "خدا سے متعلق الحاد کے دس سوالات"، "عید الاضحیٰ اور قربانی کی اہمیت"، "گفتگو کے اوصاف"، "نبی کی بشریت" اور "سوال وجواب"۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

"البیان" ترجمۂ قرآن کی آڈیو بک

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام تذکیر بالقرآن پراجیکٹ کے تحت گذشتہ ماہ سورۂ کہف اور سورۂ نور کی تلاوت اور ترجمہ پیش کیا گیا۔ غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن شاہ نواز صاحب، جب کہ قرآن مجید کی تلاوت مشاری راشد العفاسی کی آواز میں ہے۔ ان کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

Ask Dr. Shahzad Saleem

یہ سوال وجواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔

"اسلام اسٹڈی سرکل"

ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب کے اس سیشن میں مختلف دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث ہوتی ہے۔ یہ سیشن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قرآن مجید کی آیات سے ایک موضوع منتخب کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں منتخب احادیث نبوی پر گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں بائیبل کے کسی اقتباس کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے کے سیشن میں "عقائدِ ایمان"، "دنیا کی بے مائیگی" اور "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنی نوع انسان کے لیے رہنمائی" جیسے موضوعات زیر بحث رہے۔ یہ سیشن انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ اس کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

جون 2024ء میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی نشستوں میں غامدی صاحب نے سورۂ کہف کی 6 تا 26 آیات کا درس دیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں ''عذاب قبر'' کے حوالے سے احادیث پر بات ہوئی۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 30 سے زائد سیشنز ہوئے۔ ان سیشنز میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

''مقامات'' کی آڈیو بک

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاوید احمد غامدی صاحب کی کتاب ''مقامات'' کی آڈیو بک کا اجرا ہو گیا ہے۔ یہ کتاب غامدی صاحب کی متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے، جسے انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: پہلا حصہ ان کے جذبات و احساسات اور حالات و وقائع پر مشتمل ہے۔ دوسرے میں بعض توضیحات اور دین کے اجتہادی مسائل سے متعلق ان کی آرا بیان ہوئی ہیں۔ تیسرا حصہ تنقیدی مضامین کے لیے خاص ہے۔ اس کتاب کو آڈیو کی صورت میں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا جا رہا ہے۔

''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

شہزاد سلیم صاحب غامدی صاحب کی تفسیرِ قرآن ''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا

فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ ڈاکٹر شہزاد سلیم نے اس کے 2 لیکچرز ریکارڈ کرائے، جن میں سورۂ آل عمران کی آیات 1 تا 44 زیر بحث آئیں۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''سفر در سفر''

یہ پروگرام ڈاکٹر عمار خان ناصر کی فکری سرگذشت پر مبنی ہے، جسے کی میزبانی کی ذمہ داری نعیم بلوچ صاحب نے اٹھائی ہے۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر عمار خان ناصر اپنی فکری سرگذشت کے حوالے سے نعیم بلوچ صاحب کے سوالوں کے جواب دیں گے۔ گذشتہ ماہ اس کی 2 نشستیں ریکارڈ ہوئیں، جن میں عمار صاحب نے اپنے خاندانی پس منظر، تعلیمی مراحل اور فکری سفر کے کچھ اہم گوشوں پر بات کی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

توہین مذہب کا قانون: ذمہ دار کون؟

''پاکستان میں توہین مذہب پر لوگوں کو مارنے کے رجحان کا ذمہ دار کون ہے؟'' حسن الیاس صاحب نے یہ سوال سوات میں ہونے والے توہین مذہب کے واقعے کے پس منظر میں اٹھایا ہے۔ اپنی ایک گفتگو میں اس واقعے کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے اس طرح کے واقعات کے ذمہ داروں کا تعین کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے معاشرے میں اس طرح کے واقعات روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب دین کے نام پر ہو رہا ہے۔ مزید برآں انھوں نے اس طرح کے واقعات کے سدباب کے لیے بعض مفید حل بھی پیش کیے۔ اس گفتگو کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کا انگریزی زبان میں خلاصہ

23 اعتراضات کی اس ویڈیو سیریز میں غامدی صاحب کے افکار پر روایتی مذہبی فکر کی طرف سے کیے گئے اعتراضات اور تنقیدات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد سلیم اس سیریز میں اب

تک کے زیر بحث آنے والے تمام موضوعات کا انگریزی زبان میں خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے 23 اعتراضات کی سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''نزولِ مسیح'' کا خلاصہ بیان کیا۔ ان پروگرامز کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

''نیا زمانہ، نئے چیلنجز''

حسن الیاس صاحب نے ''نیا زمانہ، نئے چیلنجز'' کے عنوان سے ایک پوڈکاسٹ ریکارڈ کرایا ہے۔ اس پوڈکاسٹ میں مذہب کو درپیش جدید چیلنجز، روایتی علما کے فکر اور غامدی صاحب کے فکر کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ آخر میں میزبان علی صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غامدی صاحب جیسے بڑے آدمی کا فکر کسی شخص کی میراث نہیں ہوتی، بلکہ وہ قوموں کی امانت ہوتی ہے۔ اور اس طرح کے آدمی کے فکر کی وراثت انھی کو منتقل ہوتی ہے، جو اس کو پوری طرح سمجھ کر دوسروں کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

''میزان'' اور ''فرقان'' کی توضیح

کچھ عرصہ قبل شہزاد سلیم صاحب نے 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''میزان'' اور ''فرقان'' کی توضیح کا انگریزی زبان میں خلاصہ ریکارڈ کرایا تھا۔ اس ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر کر دیا گیا ہے۔